قرآن کریم اور سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۵ شمارہ: ۷، ۸

رجب، شعبان: ۱۴۳۳ھ - جون، جولائی: ۲۰۱۲ء

قیمت موجودہ شمارہ: ۱۰۰ روپے، زر سالانہ: ۳۰۰ روپے

مدیر/مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

مجلس ادارت

مولانا محمد اعجاز مصطفی (مدیر معاون)

مولانا عطاء الرحمن صاحب (ناظم تعلیمات)

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

ماہنامہ "بینات"، پوسٹ بکس نمبر ۳۴۶۵، کراچی ۷۴۸۰۰

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فون دفتر بینات: ۳۴۹۲۷۲۳۳

فون جامعہ: ۳۴۹۱۳۵۷۰-۳۴۱۲۱۱۵۲-۳۴۱۲۳۳۶۶

ایکسٹینشن: ۱۴۶-۱۴۷

فیکس: ۳۴۹۱۹۵۳۱-۲۱-۹۲

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ،

ناروے ویسٹ انڈیز وغیرہ: ۳۵ر امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان،

ایران، انڈیا وغیرہ: ۲۷ر امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: ۲۵ر امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر   مطبع: ایجوکیشنل پریس کراچی   طابع: فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

اسلام دشمنی کی تحریک ..... پسِ منظر، پیش منظر	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

اسلام کا معاشی نظام	۱۱	حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ
اسلامی حکومت کا شعار اور مسلمان حکمرانوں کا کردار (آخری قسط)	۱۶	حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ
کاروانِ بنوری کی متاعِ عزیز، مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کا سوانحی خاکہ	۲۳	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
صبحِ وصال تا شبِ ہجر، شیخ عطاءؒ سے رفاقت کی چند جھلکیاں	۳۲	مولانا امداد اللہ صاحب
شیخ عطاء شہید رحمہ اللہ	۳۶	مولانا فضل محمد یوسف زئی
استاذِ محترم مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کی چند یادیں، چند باتیں	۴۱	مولانا محمد سفیان بلند
من پدر گم کردہ اَم	۶۱	مولانا طلحہ منیر
باتیں اُن کی یاد رہیں گی	۷۲	مولانا محمد کامران اجمل
طیارہ حادثہ اور اہلِ علم کی رحلت	۸۷	جناب عبدالقدوس محمدی
کچھ یادیں، کچھ باتیں	۹۰	مولانا محمد عمران ولی
استاذِ محترمؒ کی چند حسین یادیں	۹۷	مولانا اکرام اللہ خان
علم و عمل کا بحرِ بے کراں	۱۰۱	محمد اسد اللہ غالب بلتستانی
آہ! مشفق استاذؒ	۱۰۶	مولانا محمد طیب لدھیانوی
حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ، ایک شخص، ایک انجمن	۱۰۹	مولوی محمد یاسر عبداللہ
شیخ عطاء شہیدؒ کی چند وہبی و کسبی نمایاں خوبیاں	۱۱۳	ابوالوفاء المشہدی
دار العلوم دیوبند کا قیام اور مفتی سعید خان کا انکشاف	۱۱۵	حافظ زاہد حسین رشیدی، چکوال
موسمِ گرما کی تعطیلات اور چالیس روزہ دینی و اخلاقی تربیتی کورس	۱۳۰	مولانا محمد اشرف ہارون
ماہِ رجب میں ہونے والی بدعات، ایک تحقیقی جائزہ	۱۳۴	مفتی محمد راشد ڈسکوی
زبان کی آفتوں کا بیان	۱۴۵	مولانا غلام مصطفیٰ
حضرت مولانا قاری شریف احمدؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ	۱۵۷	قاری تنویر احمد شریفی، کراچی

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا سید محمد محسن شاہؒ کی شہادت	۱۶۱	مولوی حکیم اللہ وزیر
مجسمِ وفا، مفتی عرفان شہیدؒ	۱۶۵	مولوی سہیل یوسف میمن
حضرت شہید کا تحقیقی ذوق	۱۶۸	مولوی عمران ممتاز

دار الافتاء

قرآن پاک کے علاوہ دیگر آسمانی کتب یا ''گیتا'' کا مطالعہ	۱۷۲	مولوی محمد یوسف انور

نقد و نظر

نقد و نظر	۱۷۴	ادارہ

اسلام دشمنی کی تحریک

پسِ منظر......پیش منظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

مغربی استعمار نے تجارت کے نام پر ہندوستان پر قبضہ کیا، یہاں کے مسلم حکمرانوں کو تہہ تیغ کیا، علمائے کرام کو سولی پر لٹکایا، محب دین عوام کو گاجر مولی کی طرح کاٹا، استعمار کے اس ظلم و جور کے سامنے بند باندھنے کے لئے بچے کھچے علمائے کرام نے استخلاص وطن کی تحریک چلائی، مخلص و مسلم عوام نے ساتھ دیا، نتیجتاً اس غاصب اور جابر استعمار کو یہاں سے بوریا بستر گول کرکے بھاگنا پڑا۔

مسلمانوں کی اس جدوجہد آزادی کے نتیجے میں نوزائدہ ملک پاکستان وجود میں آیا، پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد یہاں کے اقتدار اور مناصب پر ہواء وہوس کے بیماروں اور مال وزر کے پجاریوں نے قبضہ جمالیا، انہوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے اور حرص وطمع کی آگ بجھانے کے لئے انگریز کی غلامی کو قبول کیا اور اس مملکت خداداد پاکستان کی خودداری وخودمختاری کو اپنے ان آقاؤں کے پاس گروی رکھ دیا۔

جس طرح انگریز اپنے ایجنڈے اور خواہشات کی تکمیل میں مسلمانوں خصوصاً علماء کرام کو حارج اور اپنی راہ کا بھاری پتھر سمجھتا تھا، اسی طرح اقتدار کے بھکاریوں نے بھی مسجد ومدرسہ، محب دین ومحب وطن علماء، طلبا اور دین دار مسلمانوں کو اپنے آقاؤں کے ناپاک عزائم اور غلیظ پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی راہ میں حائل اور رکاوٹ سمجھا۔

اس لئے انہوں نے ایک طرف تو اس ملا، مولوی سے جان چھڑانے کے لئے دہلی سیکٹریٹ اور پاکستان بننے کے بعد کراچی سیکٹریٹ میں ملازمت کرنے والے انگریز کے ساختہ وپرداختہ مسٹر غلام احمد پرویز کو دریافت کیا، جس نے کہا:

''قرآن کریم میں جہاں اللہ ورسول کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد ''مرکزِ نظام

حکومت ہے''۔ (معارف القرآن، ج:۴،ص:۶۲۳)

اور جس نے کہا:

''جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے، صدقات نکلتے رہیں گے، زکوٰۃ دی جاتی رہے گی، قربانیاں ہوتی رہیں گی، لوگ حج بھی کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر، بے در، بھوکی ننگی اسلام کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی''۔ (قرآنی فیصلے، ص:۵۲ بحوالہ شخصیات وتأثرات، ص:۶۴)

اس کے بعد اس گروہ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا، کراچی میں ایک ''مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی'' قائم کیا اور اس کے لئے کج رو اور کج ذہن ملاحدہ کی اکثریت کو بھرتی کیا، جس کی سربراہی کے لئے میکگل یونیورسٹی کے ایک مستشرق ڈاکٹر فضل الرحمن کو امریکہ سے درآمد کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو ''ادارہ تحقیقاتِ اسلامی'' کے ذریعہ کیا کام تفویض کیا گیا تھا؟ اس کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ایک مکتوب (جوانہوں نے ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا) کا حوالہ دینا ضروری ہوگا، موصوف لکھتے ہیں:

''کئی سال ہوئے، ایک بہت بڑے مسلمان سرکاری عہدے دار نے (جو غالباً ''سر'' کا خطاب بھی رکھتے ہیں) مجھ سے دورانِ گفتگو میں کہا تھا کہ آپ لوگ اور آپ کے یہ مذہبی گھروندے (مدرسے اور خانقاہیں) صرف اس لئے ہندوستان (متحدہ ہندوستان) میں باقی ہیں کہ انگریزی حکومت کی پالیسی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، جس دن یہ پالیسی ہمارے ہاتھ میں آجائے گی، ہم آپ لوگوں اور آپ کے ان اڈوں کو ختم کردیں گے اور ''مداخلت فی الدین'' کے نعروں سے آپ عوام میں جو ہیجان انگریز یا ہندو کے خلاف پیدا کردیتے ہیں، ہمارے خلاف پیدا نہیں کرسکیں گے، ہم جو کچھ کریں گے مسلمان قوم کو ساتھ لے کر کریں گے اور رائے عامہ کو اتنا زیادہ تیار کریں گے کہ وہ آپ لوگوں کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں گے، جیسا کہ ٹرکی میں ہوچکا ہے''۔ (انوارِ عثانی، ص:۱۵۲)

یعنی اس ادارہ کا مقصد اسلام اور حاملانِ اسلام کے خلاف مسلمانوں کے ذہن تیار کرنا، عوام کی ذہنیت کو اس سطح پر لے آنا کہ وہ اسلام اور علمائے اسلام کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں۔ دین اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے اور اس کا حلیہ بگاڑنے کے لئے مسلمانوں کے اسلام کو ''روایتی اسلام، فرسودہ اسلام، جامد اسلام'' جیسی اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا۔ ذخیرۂ احادیث کو قرونِ وسطیٰ کی پیداوار بتایا گیا، اسلامی شریعت کا مأخذ رومن قانون کو بتایا گیا، قرآن کریم کو پیغمبر کے اندرونی احساسات کی آواز ٹھہرایا گیا، سود اور شراب کو حلال قرار دیا گیا۔

دوسری طرف اس گروہ نے علماء کرام اور دین دار عوام کی تحقیر وتوہین کو اپنا وطیرہ بنالیا اور ایک عرصہ تک ظاہراً یہ رٹ لگائی گئی کہ ہم تو ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ ملا اور مولوی ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور اندرونِ خانہ دین دار عوام اور علماء کرام کو مٹانے کے منصوبے بنائے گئے۔

اس کے لئے انہوں نے اللہ کے دشمنوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باغیوں، ملحدوں اور دین بیزار لوگوں کو اہم حکومتی مناصب پیش کئے، جس کی بنا پر ملکِ عزیز پاکستان آج تک اپنے اس مقصدِ وجود کو نہ پاسکا، جس کے لئے وہ بنایا گیا۔ اس گروہ نے ۱۹۵۳ء میں دس ہزار مسلمانوں کا خون بہایا، اکابر علمائے امت کو جیلوں میں ٹھونسا، ۱۹۷۴ء میں غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا، تحریک نظام مصطفیٰ کی پاداش میں علمائے کرام کو برف کی سِلوں پر لٹایا، ان پر وحشیانہ تشدد کیا گیا، ان کے مدارس اور مساجد کو بند کرنے اور حکومتی تحویل میں لینے کے منصوبے بنائے گئے۔

ماضی قریب میں اس گروہ کا ایک نمائندہ جب پاکستان کی کرسی صدارت پر قابض ہوا تو اس نے کہا:

''اسلام امن، روشن خیالی اور محبت کا مذہب ہے، مسلمانوں میں یہ شعور ہونا چاہئے کہ اسلام کو خود سمجھیں، نہ کہ ہم اسلام کو مولوی صاحبان کے حوالے کردیں، اور خود الگ ہوکر بیٹھ جائیں، کوئی بھی مولوی یا باریش شخص مسجد میں کھڑے ہوکر جو مرضی بکواس کرے، غلط سلط کہتا رہے، ہم اسے کچھ نہیں کہتے، اس لئے غیر منطقی اور فضول باتیں کہنے کا سلسلہ بڑھتا جارہا ہے، ہم میں جرأت ہونا چاہئے، اگر کوئی عقل کی بات نہیں کرتا تو اسے ٹوکنا چاہئے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایسے لوگوں سے تعاون نہیں، بلکہ انہیں گرفتار کروانے کی ضرورت ہے......''۔ (روزنامہ جنگ کراچی ۲۱ نومبر ۲۰۰۳ء)

موصوف نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے وانا آپریشن کرکے جہادی کیمپوں کا صفایا کیا، جہاد اور مجاہدین پر پابندی لگائی، دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کے منصوبے بنائے، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے نصاب سے آیات جہاد کا اخراج کیا، ماڈل دینی مدارس کو متعارف کرایا، حدود آرڈی نینس کو منسوخ کیا، پاسپورٹ سے مذہب کے خانہ کا خاتمہ کیا، اسکول کا تعلیمی نظام آغا خان بورڈ کو سپرد کیا۔

اس گروہ کے انہی عزائم کی تکمیل کے لئے ایک طرف الحاد وزندقہ کے نئے ایڈیشن جناب جاوید احمد غامدی اور زید حامد کی صورت میں سامنے لائے گئے، دوسری طرف مسجد، مدرسہ، مولوی، ملا اور دینی مدارس کے خلاف سمعی وبصری میڈیا پر خوب پروپیگنڈہ کیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ عوام

الناس کو علماء سے متنفر کرنے کے لئے ٹی وی پر مباحثے اور مذاکرے کرائے گئے، وظیفہ خور اینکرز اور دین بیزار صحافیوں سے دینی معتقدات کے خلاف کالم سیاہ کرائے گئے، جس سے یہ تأثر ملے کہ علماء خود ایک مسئلہ پر متفق نہیں تو عوام الناس کو اتفاق اور اخلاقیات کا کیا درس دیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ مسجد، مدرسہ اور دینی حلقوں سے دور اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا ایک مخصوص طبقہ دین، اہل دین اور علمائے کرام سے دوری کی بنا پر بے دین، ملحدوں اور دین بیزار لوگوں کا شکار ہو رہا ہے۔

علماء کرام کے بارہ میں اس طبقے کی انہی ''ریمارکس''، ''سنہری ارشادات''، ان کے ''والہانہ کردار'' اور ''محبت بھرے'' تذکرہ کی بنا پر پورے ملک میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص دینی اداروں، دینی قیادت اور دین پسند لوگوں کے خلاف ایک فضا بنائی گئی، متعدد پاک و پاکیزہ نفوس اور دسیوں علمائے حق کے مقدس لہو سے زمین رنگین کی گئی، ان کو خاک وخون میں تڑپایا گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مولانا محمد عبداللہؒ اسلام آباد، مولانا عبیداللہ چترالیؒ، مفتی محمد مجاہدؒ فیصل آباد، مولانا انیس الرحمٰن درخواستیؒ، مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختارؒ، مفتی عبدالسمیعؒ، شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مولانا عنایت اللہؒ، مفتی محمد اقبالؒ، مولانا عبدالحمید عباسیؒ، مولانا اعظم طارقؒ، مولانا مفتی نظام الدین شامزئیؒ، مفتی محمد جمیل خانؒ، مولانا نذیر احمد تونسویؒ، مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقیؒ، جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات، مولانا غازی عبدالرشیدؒ، مولانا سعید احمد جلالپوریؒ، مولانا سعید احمد اخوندمردانیؒ، مولانا ارشاد اللہ عباسیؒ، مولانا عبدالغفور ندیمؒ، مولانا علی شیر حیدریؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ مولانا حسن جانؒ، مولانا نور محمدؒ آف وانا، مولانا نصیب خانؒ، مولانا سید محسن شاہؒ اور اب مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کو راستے سے ہٹایا گیا، یہ چند شہداء کے نام نوکِ قلم پر آ گئے، جنہیں اسلامی زندگی اپنانے اور دوسروں کو تعلیم وتعلم اور عبادات پر لگانے کی پاداش میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ''تمغۂ شہادت'' عطاء کیا گیا۔

کراچی کی حد تک تقریباً تمام معروف مدارس دہشت گردی اور علماء کشی کا شکار ہو چکے ہیں، ان میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی، جامعہ اشرف المدارس گلشن اقبال، جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا، جامعہ دارالخیر گلستان جوہر، جامعہ رحمانیہ بفرزون، دارالعلوم حنفیہ اورنگی ٹاؤن، جامعۃ الرشید احسن آباد، جامعہ انوار القرآن، اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت سرفہرست ہیں۔

مولانا اسلم شیخوپوری شہیدؒ جو دونوں پاؤں سے معذور تھا، چلنے پھرنے سے عاجز تھا، کسی سہارے کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے سے لاچار تھا، جس کا دل امتِ مسلمہ کے لئے تڑپتا اور دھڑکتا تھا، انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے روشناس کراتا تھا، کیا اس کا یہی قصور تھا کہ وہ اللہ کی مخلوق کو اللہ

کا قرآن کیوں سناتا ہے؟ دین دشمنوں کو کیوں للکارتا ہے؟ امت مسلمہ کو ان کے زوال کے نقصانات کیوں بتلاتا ہے؟ انہیں ایمانی غیرت وحمیت اور آزادی وحریت کا درس کیوں دیتا ہے؟ اسی لئے اسے راستہ سے ہٹایا گیا۔ اسی طرح اَسی سالہ بوڑھا بزرگ مولانا سید محسن شاہ شہیدؒ جس نے ساری زندگی ''قال اللہ وقال الرسول'' کہتے گزاری، اسے عین تہجد کے وقت خنجر جیسے تیز دھار آلہ سے ذبح کیا گیا، یہ کس کے ایجنڈے کی تکمیل کی جارہی ہے اور کن آقاؤں کی خدمت گزاری کی جارہی ہے؟ افسوس ہے آج کے حکمرانوں پر اور افسوس ہے مغرب کے ایجنڈے کی تکمیل کرنے والوں پر۔

....

روس کی شکست کے بعد نیٹو کے سیکرٹری جنرل javie solana سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اب نیٹو کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ: ''اب نیٹو کا ہدف اسلام ہے'' یہی وجہ ہے کہ پہلے ایران، عراق جنگ کرائی گئی، اس کے بعد کویت پر حملے کے لئے عراق کو تھپکی دی گئی، پھر عالمی جھوٹ کی بنا پر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اس کے بعد افغانستان پر حملہ کیا گیا۔ مصر، تیونس، لیبیا، شام کے ممالک میں سے کسی میں خانہ جنگی کرائی گئی تو کسی ملک کے سربراہ کو جلاوطن کرایا گیا۔ کسی کو پنجرے میں بند کرکے عدالتوں کے چکر لگوائے گئے تو کسی کے سربراہ کو سڑکوں، چوراہوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر مروایا گیا اور اب پاکستان اور ایران کو آنکھیں دکھائی جارہی ہیں۔

نائن الیون کے مصنوعی ڈرامہ کے بعد امریکہ کے موجودہ صدر بارک اوباما نے کہا تھا کہ: ''امریکہ پر دوبارہ ایسا حملہ ہوا تو خانہ کعبہ پر بمباری کرکے اسے تباہ کردیا جائے گا'' اور اب یہ خبر آئی ہے کہ امریکی فوجی اکیڈمیوں کے نصاب میں اسلام کے خلاف عالمی جنگ کی تیاری کا سبق شامل کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لئے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ کورس میں شریک افسران کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے خلاف مزاحمتی تحریک کا حصہ سمجھیں۔ مذہب اسلام کو اپنا دشمن تصور کریں۔ اور کہا گیا کہ امریکہ دنیا میں صرف مسلمان انتہا پسندوں سے نہیں، بلکہ اسلام سے حالت جنگ میں ہے۔ اور خبر میں ہے کہ یہ نصاب ان فوجیوں کو ۲۰۰۴ء سے پڑھایا جارہا ہے، اور سال میں پانچ مرتبہ اسے دہرایا جاتا ہے، تفصیل اس خبر میں پڑھ لیجئے:

> ''واشنگٹن (امت نیوز/خبرایجنسیاں) امریکی فوجی اکیڈمیز میں مستقبل کے اعلیٰ افسران کو پورے عالم اسلام کے خلاف مکمل جنگ کی تعلیم دی جارہی ہے اور پڑھایا جارہا ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لئے تیسری عالمی جنگ شروع کرکے دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اسلام مخالف کورس میں ہمارے مقدس ترین مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر ایٹمی حملے اور ہلاکت خیز بمباری کی حکمت عملی کا بھی انکشاف ہوا ہے۔ ورجینیا کے جوائنٹ فورسز اسٹاف کالج

سمیت امریکی فوج کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اسلام سے نفرت پر مبنی نصاب پڑھانے کا انکشاف گزشتہ ماہ اپریل میں سامنے آیا تھا، مگر اس کی تفصیلات باہر نہیں آسکی تھیں ۔ نئے انکشاف کے بعد امریکی افواج کے سربراہ مارٹن ڈیمپسی نے فوجی اداروں میں اسلام کے بارے میں پڑھائے جانے والے نصاب کی مذمت کی اور تحقیقات کا حکم دیا ہے ۔ اسلام مخالف کورس بنانے اور اس پر لیکچر دینے والے لیفٹننٹ کرنل میتھیو اے ڈولی کو معاملہ سامنے آنے کے بعد نصاب پڑھانے سے روک دیا گیا ہے، لیکن کوئی تادیبی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی ۔ سارے معاملے کا انکشاف کرنے والی ایک امریکی ویب سائٹ کے مطابق اس کورس میں شرکت کرنے والے فوجی افسران اعلیٰ عہدوں اور اہم ذمہ داریوں پر کام کررہے ہیں، جن میں لیفٹننٹ کرنل کرنل، کمانڈر اور نیوی کے کیپٹن شامل ہیں ۔ کورس ۲۰۰۴ء سے پڑھایا جارہا ہے اور سال میں ۵ مرتبہ دہرایا جاتا ہے ۔ شریک افسران کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے خلاف ''مزاحمتی تحریک'' کا حصہ سمجھیں، اسلام میں اعتدال پسندی نام کی کوئی چیز نہیں اور وہ اس مذہب کو اپنا دشمن تصور کریں ۔ انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ امریکہ دنیا میں صرف مسلمان انتہا پسندوں سے نہیں، بلکہ اسلام سے جنگ کی حالت میں ہے اور اگلے مرحلے میں یہ ممکن ہے کہ امریکہ مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات مکہ اور مدینہ کو جوہری حملوں اور ہلاکت خیز بمباری کے ذریعہ تباہ کرادے، چاہے اس میں کتنی ہی اموات کیوں نہ ہوں، جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما، ناگاساکی اور ڈریسڈن (جرمنی) کے ساتھ کیا گیا ۔ کورس میں بتایا گیا کہ آج کے دور میں اسلامی انتہا پسندوں سے جو خطرات ہمیں درپیش ہیں، ایسے میں جنگی قوانین سے متعلق جنیوا کنونشن اور اس پر اقوام متحدہ کی توثیق کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے اور جہاں ضرورت پڑے سویلین آبادی کو بھی حملوں کا نشانہ بنایا جائے ۔ لیفٹننٹ کرنل میتھیو اے ڈولی نے افسران کو پڑھایا کہ وقت آگیا ہے کہ امریکہ اپنا ہدف واضح کرلے، بربنظر یہ کو مزید برداشت نہیں کیا جاسکتا، اسلام کو بدلنا ہوگا، ورنہ ہم خود اسے مٹا کر دم لیں گے ۔ امریکی کرنل نے اسلام کے خلاف ۴ مراحل پر مبنی منصوبہ پیش کیا، جس کا تیسرا حصہ مسلمانوں کو دنیا سے مٹا کر ایک مختصر گروہ میں تبدیل کردینا اور سعودی عرب کو بھوک وافلاس کے بحران سے دوچار کرنا ہے ۔ امریکی محکمہ دفاع پنٹاگون نے اپنی فوجی اکیڈمیوں میں یہ کورس پڑھائے جانے کی تصدیق کی ہے ۔ ترجمان کے مطابق چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف جنرل مارٹن ڈیمپسی نے امریکی فوجی افسران کے لئے اس اختیاری کورس کو قابل

اعتراض قرار دیا ہے اور کہا کہ یہ کورس امریکہ کی ان قدروں کے منافی ہے جو دوسرے مذاہب اور رسم ورواج کے احترام اور آزادی پر مبنی ہیں۔ امریکی میڈیا نے بتایا کہ جنرل ڈیمپسی نے اس کورس کو پڑھنے والے ایک فوجی کی اپریل کے اواخر میں کی گئی شکایت سامنے آنے کے بعد فوجی اسکولوں میں کسی مذہب سے متعلق پڑھائے جانے والے کورس کے حوالے سے مکمل تحقیقات کا حکم دیا ہے۔ امریکی فوجی اکیڈمیوں میں فوجی افسران کے علاوہ سرکاری حکام کو بھی جنگی منصوبہ بندی کے کورسز میں اسلام دشمنی پر مبنی یہ تعلیم دی جاتی ہے، تاہم اب معاملہ سامنے آنے پر تحقیقات کی جارہی ہیں کہ اس کورس کو پڑھانے کی منظوری کیسے ملی؟ اور کیسے یہ نصابی کتب کا حصہ بنا؟ پینٹا گون کے مطابق اس حوالے سے مکمل رپورٹ رواں ماہ کے آخر تک سامنے آجائے گی۔ امریکی خبر ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق گزشتہ برس ایف بی آئی میں بھی ایسے ہی ایک اسلام مخالف کورس کو بند کردیا گیا تھا''۔ (روز نامہ امت، ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۲ مئی ۲۰۱۲ء)

جولڑائی اور دشمنی نام نہاد بنیاد پرست، انتہاء پسند، تنگ نظر، دہشت گرد، ملا، مولوی، مسجد، مدرسہ، مجاہد سے شروع کی گئی تھی، اب وہ یہاں تک پہنچادی گئی ہے کہ ہر کلمہ گو مسلمان ان کا دشمن، واجب القتل اور قابل گردن زدنی ہے اور اس دشمن سے نمٹنا اور اسے نیست ونابود کرنا ان صلیبیوں کا اولین مقصد ہے۔

اسی لئے امریکہ نے جب عراق پر حملہ کیا تھا تو اس وقت ''قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید'' کے مصداق حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہیدؒ نے بینات صفر ۱۴۲۴ھ مئی ۲۰۰۳ء کے اداریہ میں لکھا تھا کہ: ''امریکی ہدف صدام نہیں، بلکہ اسلام ہے'' ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو، لیکن یہ حالیہ خبر حضرت شہیدؒ کے ہر ہر اندیشے کو نہ صرف یہ کہ حرف بحرف ثابت کررہی ہے بلکہ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کا منہ بھی چڑا رہی ہے۔

ہمارے خیال میں اب بھی وقت ہے کہ عالم اسلام کے حکمران اور قائدین تدبر وفراست کا ثبوت دیتے ہوئے اسلام، شعائر اسلام، مقامات مقدسہ، اسلامی اقدار اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے پالیسیاں وضع کریں اور ہمت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امریکہ کی کاسہ لیسی چھوڑ دیں، ورنہ امریکہ ان کا بھی وہی حشر کرائے گا جو عالم اسلام کے ماضی قریب کے حکمرانوں کا ہوا، ولا فعل اللہ ذلک۔

عام مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ توبہ واستغفار کریں، اپنے آپ کو دین اسلام کے ساتھ وابستہ رکھیں، اسلامی تعلیمات پر عمل کریں، آپس میں اتحاد واتفاق کا درس دیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت کریں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اپنے وجود پر سجائیں، ان شاء اللہ! فتح اسلام اور مخلص مسلمانوں کی ہوگی۔

....

تشکر و امتنان

۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰/ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ کی خونی شام کو نمازِ مغرب سے کچھ دیر پہلے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم تعلیمات، استاذ الحدیث، استاذ العلماء حضرت مولانا عطاء الرحمٰن اپنے سفر وحضر کے ساتھی مولانا محمد عرفان میمن اور اپنی بہن سمیت بھوجا ائیرلائن کے طیارہ کے حادثہ میں اسلام آباد ائیرپورٹ کے قریب بستی حسین آباد میں شہید ہوگئے تھے۔

اس الم ناک اور اذیت ناک حادثہ پر جامعہ کے فضلاء، جامعہ کے محبین، مخلصین، متعلقین اور حضرت مولانا مرحوم کے رفقاء، تلامذہ اور احباب نے جس خلوص و اخلاص کے ساتھ اس غم کو اپنا غم جانا اور دور دراز کا سفر طے کرکے حضرت مولانا شہیدؒ کے جنازہ میں شریک ہوئے، اسی طرح ان کے اعزہ واقرباء سے دلی ہمدردی کے اظہار اور تعزیت کے لئے وہاں پہنچے یا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تشریف لاکر یا ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے اکابرِ جامعہ واساتذۂ جامعہ سے دلی غم کا اظہار اور تعزیت کی یا اب تک اظہارِ تعزیت کررہے ہیں۔

ان تمام محبین، متعلقین، علماء ومشائخ اور جملہ احباب کا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، نائب رئیس مولانا سید محمد سلیمان بنوری صاحب، نومنتخب ناظم تعلیمات جامعہ، اساتذۂ جامعہ، حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کے والد گرامی جناب مشفق الرحمٰن صاحب، مولانا کے برادران گرامی حضرت مولانا انعام اللہ صاحب، حضرت مولانا لطف الرحمٰن صاحب، جناب احمد الرحمٰن صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا شہیدؒ کے صاحبزادگان مولانا مسیح الرحمٰن، مولانا فصیح الرحمٰن، حافظ جمیل الرحمٰن اور حافظ ملیح الرحمٰن، یہ سب حضرات تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کے لئے دعاگو ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو دونوں جہانوں میں بہترین بدلہ اور جزائے خیر عطا فرمائیں اور ہم سب کو ناگہانی آفات وبلیات سے محفوظ فرمائیں۔

قارئینِ بینات اور جملہ احباب سے درخواست ہے کہ ان شہداء کے لئے ایصالِ ثواب کرتے رہیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں اور ان کو جنت الفردوس کا مکین بنائیں۔

نوٹ: چونکہ اس شمارہ میں مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمہ اللہ کے حالات پر مضامین اور دورانِ درس طلباء کی اصلاح کے لئے آپ کے ارشاد فرمودہ نصائح شاملِ اشاعت ہیں، اس لئے یہ شمارہ دو ماہ رجب المرجب اور شعبان المعظم کا بدل تصور کیا جائے۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا محمد وعلیٰ آله وصحبه اجمعین

اسلام کا معاشی نظام

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

اسلام کے بالمقابل اس وقت دو نظام مملکت یا نظام معیشت ہیں، جو ساری دنیا کو دو حصوں میں بانٹ چکے ہیں: نظام اسلام یا دین اسلام وہ قدیم ترین نظام ہے، جس کا سرچشمہ غارِ حرا سے نکل کر آگے سمندر بن گیا اور اب تک دنیا کو اپنے فیض سے سیراب کر رہا ہے۔

اسلام صرف مادی نظام نہیں، بلکہ وہ ایک مکمل ترین پیغام الٰہی ہے، جو قرآن کریم کی شکل میں نمودار ہوا اور نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ عقلائے عالم کا دلوں سے اور زبانوں سے، کتابوں سے اور اخبارات سے اس کا اعتراف ہے کہ قرآن کریم جیسا مکمل نظام حیات اور ذات مصطفیٰ محمد رسول اللہ ﷺ جیسا کامل ترین رہنمائے انسانیت پیدا نہیں ہوا۔ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کا آخری پیغام نجات ہے، ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے اس میں ہدایت وفلاح ہے اور سعادت دارین کا بھی سرچشمہ ہے، مادی وروحانی، شخصی واجتماعی، اقتصادی ومعاشی، سیاسی وملکی ضرورتوں کا کفیل ہے اور اس کا دامن ایسے بیش قیمت جواہرات سے پُر ہے کہ ساری دنیا کی تہی دامنی کے افلاس کا علاج اس کے خزانۂ عامرہ سے ہوسکتا ہے۔ ایک ایسا صالح نظام ہے جو بنی آدم میں عدل وانصاف، سکون وراحت اور معاشی خوشحالی پیدا کرتا ہے۔ اس کو ایسا ہادئ برحق لایا جس نے خود اس پر عمل کیا اور عمل کروایا اور ایسے چند جانشین چھوڑے جو ان کے صحیح عملی نمونے تھے اور تاریخ عالم ان مبارک عہدوں کو عہد صدیقیؓ اور عہد فاروقیؓ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اسلام نے جس سرزمین میں آنکھیں کھولیں، وہاں اخلاقی پستی اور مذہبی تزلزل کے ساتھ معاشی پستی انتہاء درجہ کی تھی، سیاسی اعتبار سے انارکزم وطوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، دائیں بائیں دو سرمایہ دارانہ نظام مملکت تھے، ایک بیزنطی روما کی حکومت، دوسری ایرانی کسروی مملکت، ان میں عیش ونشاط وترفّہ وتنعّم، مال ودولت کی فروانی کا چرچا تھا۔ ان دونوں نظاموں کے اندر

صرف اسلام نے ایک نقطۂ اعتدال قائم کیا۔ جس طرح اسلام کا نظامِ حکومت ڈکٹیٹر شپ اور ڈیماکریسی کے درمیانی حدِ اوسط ہے، ٹھیک اسی طرح نظامِ معیشت میں ایک صراطِ مستقیم رکھتا ہے، جو افراط وتفریط دونوں سے پاک ہے۔ اشتراکیت یا سوشلزم، کارل مارکس ولینن وغیرہ کے نظامِ معیشت ہیں، جن میں اب تک محو واثبات کا عمل جاری ہے، ماسکو اس کا مرکز ہے اور دنیا پر چھا رہا ہے اور دنیا میں شاید کوئی ملک ایسا نہ ہوگا جہاں اس کے ہم نوا نہ ہوں۔ سرمایہ داری یا عیش پرستانہ حکومت وہ نظامِ معاشی ہے جو امریکہ ویورپ کے اکثر ممالک میں جاری ہے اور موجودہ ممالک اسلامیہ میں بھی یہی نظام ہے، جس کا مقصد وحید یہی ہے کہ ساری دنیا کی دولت کو اپنے خزانوں میں سمیٹ لیں اور عیش ونشاط کے سارے وسائل واسباب پر قبضہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو صرف چند تاجروں، زمین کے مالکوں، بینک کے حصہ داروں اور فیکٹریوں کے مالکوں میں محدود کرکے انہیں کے پیٹ کو بھریں، ان کی بلا سے عام خدا کی مخلوق کسی حالت میں ہو۔ درحقیقت اس سرمایہ دارانہ ذہنیت نے سوشلزم کو پھولنے اور پھلنے کا موقع دیا۔ دنیا کے دماغوں پر اشتراکیت کا مسلط ہونا اس کا حسن وجمال یا اس کا کمال نہیں ہے، بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی وہ نفرت انگیز قباحت ہے، جس نے اشتراکیت واشتمالیت میں حسن وجمال پیدا کیا۔

بیشک یہ صحیح ہے کہ اشتراکی نظامِ معیشت عام انسانوں کے پیٹ بھرنے کے لئے چارہ جوئی کرتا ہے، لیکن اس کی یہ تفریط ہے کہ انسانوں کو صرف پیٹ سمجھا اور اسی مسئلہ کو دنیا کا اہم ترین مسئلہ بنایا اور اس کو اس قدر اہمیت دی کہ مذہب واخلاق، تمدن وتہذیب، صلح وجنگ، دنیا کے سارے وقائع وحوادث کی بنیاد اسی پیٹ پر رکھی گئی۔ بلاشبہ ہم مانتے ہیں کہ: ''إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ '' یقیناً انسان جب مال دار بنتا ہے تو سرکش بنتا ہے۔ دولت کی طغیانی سے نبی کریم ﷺ نے پناہ مانگی ہے اور ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: '' خدا کی قسم! مجھے تمہارے فقر وافلاس کا اندیشہ نہیں، لیکن یہ خطرہ ضرور ہے کہ مال ودولت کی فراوانی تمہارے لئے ایسی ہی ہوگی جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں میں ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں تم بھی منہمک ہو جاؤ گے، جیسے وہ ہوئے، وہ تمہیں بھی تباہ وبرباد کردے گی جیسے وہ تباہ وبرباد ہوگئے''۔ (بخاری، کتاب الجہاد) مال کی فراوانی بہت سی گمراہیوں کی جڑ ہے، لیکن اسلام نے مال حلال کو اللہ تعالیٰ کا فضل بتایا، صحیح ذرائع سے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، عین حج بیت اللہ کے موقع پر بھی تجارت پر پابندی نہیں لگائی، کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مسلمان زندہ ہی نہیں رہ سکتا، لیکن اسلام اور قرآن کی رو سے جو شخص جتنا زیادہ کمائے گا، اتنا ہی زیادہ انفاق پر بھی مامور ہوگا، اس لئے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ جماعت کی اجتماعی خوشحالی ہوتی جائے گی۔ بہرحال اسلامی قانون سے جتنا زیادہ مال دار

ہوگا، اتنے اس پر زیادہ حقوق ہوں گے، اتنی ہی اس کی مشغولیت بڑھتی جائے گی۔

اسلام کا معاشی نظام:

برادران اسلام! جہاں تک اسلام کے معاشی نظام کا تعلق ہے، اس مختصر خطبہ میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس وقت صرف اسلامی نظام معاش کی بنیادی پالیسی کو پیش کیا جاسکتا ہے، جس کے پیش نظر اسلام کے معاشی نظام کی تفصیلات ہیں اور توقع ہے کہ اس کی وضاحت سے بڑی حد تک اسلام کا پورا معاشی نظام روشنی میں آجائے گا۔

اسلام کی معاشی پالیسی:

اسلام کی معاشی بنیادی پالیسی یہ ہے کہ سوسائٹی کا کوئی فرد اس معاشی سروسامان اور ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان کا زندہ رہنا مشکل ہو اور جو حقوق وفرائض اس پر واجب ہوتے ہیں، اُن سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز عدل کی بنیاد پر ہر شخص کے لئے معاشی لحاظ سے ترقی کے تمام راستے کھلے ہوئے ہوں۔ اسلام کے نزدیک یہ چیز بالکل غلط ہے کہ سوسائٹی کے بعض افراد کے پاس تو سامان معیشت ضرورت سے کہیں زیادہ ہو، لیکن دوسروں کے پاس اتنا بھی نہ ہو جو جسم وروح کے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے، ایک طرف دولت کی فروانی و بہتات ہو، عیش ونشاط کی محفلیں قائم ہوں، ساز وسرود، چنگ ورباب سے فرصت نہ ہو، دوسری طرف افراد نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہوں، نہ بدن ڈھکنے کے لئے پارچہ موجود ہو، نہ سر چھپانے کے لئے چھپر ہو، یہ طبقاتی زمین وآسمان کا تفاوت اسلام پسند نہیں کرتا۔ اسلام یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دولت کی گردش صرف قوم کے چند اغنیاء کے قبضہ میں محدود ہوکر رہ جائے، باقی سب افراد محروم ہوں، بلکہ اس کا منشاء تو یہ ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرہ میں ایک صحیح توازن سے ہو، تاکہ تمام افراد نفع حاصل کرسکیں: ''كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ'' میں اسی طرف اشارہ، بلکہ تصریح ہے، ایسا نہ ہو کہ اغنیاء تو مزے لوٹیں اور فقراء ومساکین فاقوں سے مریں۔

اسلام یہ جائز نہیں رکھتا کہ ملک کے تمام ذرائع آمدنی اور مواقع کار صرف چند افراد کی اجارہ داری میں ہوں اور وہ جس طرح چاہیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور دوسرے افراد یکسر ان سے محروم ہوں۔ اسلام کے نظریہ کے مطابق سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کی صلاحیت اور فطری قابلیت کے موافق ایسے مواقع فراہم ہوں کہ وہ اپنی محنت یا خدمت سے ایسا معاوضہ حاصل کرسکے، جس سے اس کی ضروریات زندگی سادے طریقے پر پوری ہوسکتی ہوں اور پھر جیسا اور جتنا جس کا کام ہو اس کے مطابق اس کو اس کا معاوضہ ملے۔ اسلام اس مساوات کا قائل نہیں کہ دنیا کا اعلیٰ ترین دماغ اپنی

خداداد دماغی کاوشوں اور فطری صلاحیتوں سے جو چیز حاصل کر سکے، ایک دیوانہ بے وقوف بھی اسی درجہ کا اس میں شریک ہو۔ قدرت نے اپنی تکوینی حکمت ربانیہ کے مطابق جس طبعی تفاوت اور تفاضل رزق کو باقی و برقرار رکھا ہے، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری ہوگی، اس لئے فرمایا:

''وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ''۔ (نحل:۷۱)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے بعض افراد کو بعض پر روزی میں بڑائی دی، پس جن کو بڑائی دی، وہ نہیں لوٹاتے اپنی روزی ان کو جن کے یہ مالک ہیں (یعنی اپنے غلاموں، باندیوں کو) کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا اللہ تعالیٰ کی نعمت کے منکر ہیں؟''۔

جو افراد محنت و کمانے سے معذور ہیں، بچے ہیں، بوڑھے ہیں، مریض ہیں اور ان کے پاس ضروریات زندگی کے لئے مال موجود نہیں، اُن کا انتظام و کفالت حکومت کے بیت المال سے کیا جائے۔ الغرض اسلام کا منشا یہ ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو تمام وہ مادی چیزیں بقدر ضرورت میسر آئیں، جن کے بغیر اس کی زندگی مشکل ہو یا فرائض وحقوق ادا کرنے سے عاجز ہو۔ اس مقصد کے مطابق اسلام نے جو معاشی اصول مقرر کئے ہیں، اگر ان کو مکمل طور پر عملی شکل دی جائے تو ایک نہایت معتدل ومتوازن معاشی نظام وجود میں آتا ہے، جس میں مذکورہ بالا تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر مناسب ہوگا کہ ان اصولوں میں چند ایک نہایت اہم بنیادی اصول پیش کئے جائیں، جن سے اندازہ لگ سکے گا کہ ان پر عمل کرنے سے معاشی مشکلات کیسے حل ہوسکتی ہیں۔

الف.....قدرت نے کائنات کے اس نظام میں جو منافع رکھے ہیں، وہ انسان کو ان سے منتفع ہونے کا برابر کا حق دیتے ہیں، کسی انسان کو ان سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے۔

ب.....کوئی شخص اگر ان قدرتی منافع کو اپنے تصرف میں لائے اور اس کے ساتھ اپنی محنت وکسب کے اثرات قائم کرے، وہ اس کا مالک بن جائے گا، اس کی اجازت یا رضامندی کے بغیر دوسرے کو صرف کا حق نہ ہوگا، جب انسان کسی چیز کا مالک بن جاتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ عطیہ، ہبہ، تبادلہ وغیرہ کا دوسرے کو مالک بنائے۔ بہرحال اسلام ملکیت وانتقال ملکیت کے اصول کو مانتا ہے۔ جس طرح انسان ان قدرتی چیزوں میں تصرف کرکے مالک بن جاتا ہے، اسی طرح وہ زمین، فیکٹری وغیرہ کا بھی مالک ہوسکتا ہے۔

ج.....کوئی شخص کسی کاروبار میں محض سرمایہ کی بنا پر جبکہ اس کے ساتھ کوئی دماغی وجسمانی محنت نہ کرتا ہو اور اس کا وہ سرمایہ ہر قسم کے نقصان سے بھی محفوظ ہو، اس سرمایہ سے انتفاع کا مستحق نہیں ہوسکتا اور اس قسم کا انتفاع اسلام کی نظر میں سود ہوگا اور سود اسلامی نظام میں قطعاً حرام ہے، سرمایہ عام

ہے کہ وہ چاندی وسونے وسکّہ کی شکل میں ہو یا بلڈنگوں اور مشینوں اور زمینوں کی شکل میں ہو، ہاں! اگر اس میں ضرر کا خطرہ ہے یا نقصان وتغیر یقینی ہے اور استعمال سے اس کی وہ حیثیت نہیں رہے گی تو اس پر انتفاع جائز ہوگا۔ کرایہ داری، اجارہ داری وغیرہ بہت سے تجارتی اور آمدنی کے وسائل میں انتفاع اس اصول کی تفصیل کے پیش نظر جائز ہوگا۔ الغرض صرف ''سرمایہ'' دولت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا ہے، اسلام کا یہ ایک ایسا بنیادی اصول ہے، جہاں اسلام اور موجودہ سرمایہ داری نظام کے ڈانڈے الگ ہوجاتے ہیں، سرمایہ داری نظام کے پیش نظر سرمایہ دولت کمانے کا ذریعہ ہے، جس طرح چاہے وہ دولت حاصل کرسکتا ہے، اسی بناپر ''سود'' کی حرمت وممنوع ہونے کا سوال ہی اس نظام میں پیدا نہیں ہوسکتا، زیادہ سے زیادہ سود کی شرح زیر بحث آسکتی ہے۔ اس نظام کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک شخص بیٹھے بٹھائے کروڑوں کا مالک بن سکتا ہے، جہاں دوسرے افراد کوڑی کے لئے محتاج نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ افراد کے لئے یہ پابندی اشتراکیت بھی لگاتی ہے، لیکن اگر حکومت اور سٹیٹ سرمایہ کو بغیر محنت وکسب دولت، مالا مال کا ذریعہ بنائے تو بنا سکتا ہے، یہیں سے اشتراکیت واسلام کے راستے الگ ہوجاتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک افراد وحکومت کے لئے ایک ہی قسم کا قانون ہے اور ایک ہی قسم کا اصول ہے، لیکن اشتراکی یہاں اکثر افراد وحکومت میں فرق کرکے سرمایہ داری کے نظام سے متفق ہوجاتا ہے۔ دراصل مشکلات صحیح اسلامی نظام کے فقدان نے پیدا کردی ہیں۔ ان مختصر اشاروں سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ معاشی مشکلات کا صحیح حل اگر ہے تو صرف اسلامی نظام میں ہے۔ اشتراکی نظام میں معاشی حل ہے، لیکن ناتمام پیٹ کا مسئلہ بھی اسلام اشتراکیت سے زیادہ بہتر طریقہ پر حل کرتا ہے۔ اگر مسلمان حکومتیں اسلامی نظام ہی پر عمل نہ کریں یا نہ سمجھیں تو یہ قصور حکمرانوں کا ہے، نظام اسلام کا نہیں۔ رہا توحید ورسالت وآخرت کا یقین، مابعد الطبیعاتی زندگی وحقائق پر ایمان لانا، اخلاق وعبادات کا وسیع ترین نظام، مخلوق کا خالق سے رشتہ جوڑنا، روحانی نعمتوں کا کیف حاصل کرنا، فرشتہ سیرت انسان بننا، خدا کی مخلوق کے لئے اخلاقی ومعاشرتی اعتبار سے خدا کی رحمت بننا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب خلافت کا حق ادا کرنا، ان سب حقائق سے اشتراکیت کا دامن خالی ہے، اشتراکیت یہاں آکر بالکل مفلس ہے، اس کے پاس ان حقائق کے حصول کے لئے کوئی وسیلہ نہیں، خود حیران وپریشان ہے، چوراہے پر کھڑا ہے، منزل مقصود کے صحیح راستہ کا کوئی علم اس کے پاس نہیں۔

برادرانِ ملت وعزیزانِ محترم! یہ ہے اسلام اور یہ ہیں غیر اسلامی نظام۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلمان بنایا ہے، اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور ایک اعلیٰ ترین نظام حیات عطا فرمایا ہے اور ہر قسم کے خزانے عطا فرمائے ہیں، ان نعمتوں کو ٹھکرا کر اعداء اسلام ودشمنانِ دین کے دروازوں پر جاکر دریوزہ گری کرنا کہاں کی غیرت ہے؟ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا عقلِ سلیم کا یہی تقاضا ہے؟ آؤ! ہم تم آج سے عہد کرلیں کہ صحیح اسلام کے لئے جان توڑ کوشش کریں، جو نظام فلاح دارین کا صحیح ذریعہ، وہ حاصل کریں۔

اسلامی حکومت کا شعار اور مسلمان حکمرانوں کا کردار

(آخری قسط)

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

اس فریضہ کی ادائیگی میں اہتمام کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر ملک کا برسر اقتدار حکمران طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ قرآن کریم کی ہدایات وترغیبات کے تحت دیانت داری کے ساتھ اپنے کل سرمایہ کا صرف چالیسواں حصہ سالانہ زکوٰۃ نکالتا اور مستحقین پر صرف کرتا رہے اور ''رفاہِ عام'' کے کاموں میں ''صدقات نافلہ'' خرچ کرتا رہے اور ''انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کو اپنا ''شعار'' بنالے تو ملک میں فقر وافلاس اور معاشی بحران کا نام ونشان تک باقی نہ رہے اور ''روز افزوں نسل اور آبادی'' کے لئے وسائل معاش کی قلت کا سوال ہی نہ پیدا ہو اور ''عائلی منصوبہ بندی'' جیسے غیر فطری اور نصوص قرآن کے صریح مخالف منصوبوں اور اسکیموں پر کروڑوں روپیہ صرف کرکے ملک کے لاکھوں مردوں کو ''نامرد'' اور عورتوں کو بانجھ اور ملک کی افرادی طاقت کو کمزور بنانے اور ملک کو یورپ وامریکہ کی ''دواساز کمپنیوں'' کی ''مانع حمل'' ادویہ کی کھپت کا مستقل ''مارکیٹ'' بنانے اور قابل قدر زرمبادلہ اس ''حماقت'' کی راہ میں ضائع کرنے کی نوبت ہی نہ پیش آئے۔

غرض ایتاء زکوٰۃ کے سلسلہ میں صرف ملک کا ایماندار ودین دار متمول خصوصاً تاجر طبقہ محض اللہ کے خوف سے پوری یا ادھوری ''زکوٰۃ'' سالانہ ادا کررہا ہے۔ ''صدقات واجبہ ونافلہ'' بھی رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کررہا ہے، فقراو مساکین کی اور ناگہانی حادثوں اور طوفانوں کا نشانہ بننے والے بے سہارا لوگوں کی حسب مقدور مدد بھی کررہا ہے، لیکن اس میں حکومت کی کارکردگی یا حکمرانوں کے شخصی اور عملی اقدام کا مطلق دخل نہیں، یعنی ملک کے برسر اقتدار اور حکمران طبقہ کے متعلق اپنے کل سرمایہ کی سالانہ باقاعدہ زکوٰۃ نکالنے اور مستحقین کو دینے کا تذکرہ کہیں نہیں آتا، حالانکہ عوام کی ترغیب اور اداء زکوٰۃ کی ملک میں ترویج کے لئے اس کا اعلان ضروری تھا- ہوسکتا ہے کہ اس طبقہ کے بھی کوٰہ مخیّر لوگ نجی طور پر زکوٰۃ نکالتے ہوں مگر اس طریق پر زکوٰۃ صدقات دینے سے وہ اس ذمہ

داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے جو بحیثیت حکمران ہونے کے ان پر عائد ہوتی ہے۔

صدر مملکت، صوبوں کے گورنر اور حکمران طبقہ صرف ناگہانی آفتوں، طوفانوں اور سیلابوں میں تباہ ہونے والوں کی امداد کے نام سے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں روپیہ دیتا ہے، مگر وہ حکومت کے خزانہ سے دیتا ہے، اپنی جیب خاص سے نہیں، الا ماشاء اللہ۔ کبھی کبھی ایسے مواقع پر صدر مملکت اور صوبوں کے گورنروں کے شخصی عطیہ کا ذکر بھی آجاتا ہے مگر وہ بھی عطیہ کے نام سے، زکوٰۃ، صدقہ یا انفاق فی سبیل اللہ کے نام سے نہیں کہ وہ غالباً اس کو اپنی کسرِشان سمجھتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حکومت اور حکمرانوں کی جانب سے زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی اور صحیح مصرف میں اس کے خرچ کرنے کی نگرانی کا مطلق کوئی اہتمام نہیں، زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے مجرموں کو سزا دینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جبکہ حکومت کی فہرستِ سزا اور جرم میں زکوٰۃ ادا نہ کرنا کوئی جرم ہی نہیں۔

اس سترہ سال کے عرصہ میں اربابِ حکومت کی جانب سے ''زکوٰۃ وصدقات'' کے باب میں اگر کوئی کوشش کی گئی تو صرف یہ کہ سرکاری ٹیکسوں کی طرح زکوٰۃ وصدقات بھی خود حکومت وصول کرے اور خود خرچ کرے، لیکن یہ کوشش نہ کامیاب ہوئی ہے، نہ ہوگی۔ حکومت بھی جانتی ہے کہ زکوٰۃ وصدقات ادا کرنے والا مسلمانوں کا طبقہ اس معاملہ میں حکومت سے ہرگز مطمئن نہیں ہوسکتا کہ وہ زکوٰۃ وصدقات کو صحیح شرعی مصرف میں صرف کرے گی اور نہ ہم اس کی کسی بھی قیمت پر تائید کر سکتے ہیں کہ حکومت خود زکوٰۃ وصول اور خرچ کرے، اس لئے کہ اوقات کا حشر ہم دیکھ رہے ہیں کہ محکمۂ اوقاف ''اوقاف'' کی لاکھوں روپے کی آمدنیوں کو واقفین کی شرائط اور وقفوں کے مخصوص ومتعین مصارف کی پرواہ کئے بغیر من مانے طریق پر بے دھڑک خرچ کر رہا ہے۔ لاکھوں روپیہ تو ''محکمۂ اوقاف'' کے بے شمار افسروں اور عملہ کی بیش قرار تنخواہوں پر خرچ ہو رہا ہے، جو شرعاً کسی طرح بھی وقف کی آمدنی کا مصرف نہیں، نہ ہی شرعاً وقف کی آمدنی کو اس پر خرچ کرنا جائز ہوسکتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ''اقامتِ صلوٰۃ'' کی طرح ''ایتاء زکوٰۃ'' کے باب میں بھی حکومت اور حکمرانوں کی کارکردگی صفر کے برابر ہے۔

۳......امر بالمعروف (شرعی احکام جاری کرنا اوران پرعمل کرانا)

اسلامی حکومت کے ''شعار'' اور مسلمان حکمرانوں کے ''کردار'' میں تیسرے مرتبہ پر ''امر بالمعروف''، یعنی ملک میں شرعی احکام وقوانین جاری کرنا ہے، چونکہ پاکستان کا دستور کتاب وسنت پر مبنی ہے، اس لئے قدرتی طور پر ملک میں کتاب وسنت کے مطابق قانون نافذ کرنے کا مطالبہ ہونا چاہئے برسر اقتدار موجودہ حکومت کو ''رائے عامہ'' کے اس فطری مطالبہ اور مرکزی وصوبائی اسمبلیوں

کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر ملک میں رائج قانون کو شریعت کے مطابق بنانے کا اعلان کرنا پڑا اور اسی کے ساتھ ''اسلامی نظریہ'' کی مشاورتی کونسل کے نام سے ایک ''مشاورتی کونسل'' بھی محض عوام کو مطمئن کرنے کے لئے قائم کرنی پڑی، لیکن اس ''مشاورتی کونسل'' کی ''سفارشات'' جو درحقیقت ''شریعت اسلامیہ کے قطعی احکام'' ہیں، قانون ساز اداروں یعنی مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے لئے قطعاً درخورِ اعتنا نہیں، چنانچہ مشاورتی کونسل ہر قسم کے ''سود'' کو تجارتی ہو یا مہاجنی مطلقاً حرام قرار دے چکی ہے، مگر نہ صرف یہ کہ ملک میں تمام تجارتی اور صنعتی کاروبار علانیہ سود پر چل رہا ہے، بلکہ خود حکومت علانیہ طور پر پبلک سے سودی قرضے لے رہی ہے اور ان پر ساڑھے پانچ فیصد ''سود دینے'' کا کھلے بندوں اعلان کررہی ہے اور خود بھی پبلک سے علانیہ ''سود'' لے رہی ہے۔ مشاورتی کونسل ہر قسم کی ''شراب'' کو حرام قرار دے چکی اور شراب کی خرید وفروخت کو قانوناً ممنوع قرار دینے کی سفارش کرچکی، مگر اس کے باوجود خود حکومت کروڑوں روپے کے ''شراب فروشی'' کے ''لائسنس (شراب کی خرید وفروخت کے اجازت نامے) دے رہی ہے، مشاورتی کونسل ہر قسم کی ''قمار بازی'' اور ''جوے'' کو حرام قرار دے چکی ہے اور اس کو قانوناً بند کرنے کی سفارش کرچکی ہے، مگر ملک میں خود حکومت کی سرپرستی میں ''ریس کورس'' اور اسی قسم کے ''مہذب قمار خانے'' قائم ہیں۔

برسر اقتدار حکومت نے محض پاکستان کے دستور کی خلاف ورزی کے الزام سے بچنے کے لئے ان ''قطعی محرمات'' کو شرعاً حلال اور جائز قرار دینے کے لئے ایک ادارہ ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' کے نام سے قائم کررکھا ہے اور اس پر لاکھوں روپیہ سالانہ صرف ان ''قطعی محرمات'' کو کتاب وسنت کی رو سے حلال اور جائز قرار دینے کی غرض سے صرف کیا جارہا ہے، اس ادارہ کے تمام کارکن شب وروز ''نیا اسلام'' (ماڈرن اسلام) تیار کرنے میں -جس کی ضرورت کا برسر اقتدار طبقہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہتا ہے- مصروف ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے ''اللہ کے پسندیدہ اور کامل واکمل دین'' کو -جس کے قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس پاک سرزمین میں یہ ''تمکن فی الأرض'' (اقتدارِ اعلیٰ اور استقلال واستحکام سلطنت) عطا فرمایا تھا اور مسلمانوں نے ہزاروں لاکھوں جانیں اور عصمتیں جس ''دین'' کو قائم کرنے کے لئے قربان کی تھیں۔ اُس کامل واکمل دین اسلام کو اس ''ادارۂ تحقیقات اسلامی'' کے کارکن ''مسخ'' کرنے میں رات دن منہمک ہیں، چنانچہ یہ ادارہ ''تجارتی سود'' کو کتاب وسنت کی رو سے جائز، ''شراب نوشی'' اور یورپین ممالک میں رائج ''مہذب قمار بازی'' ریس کورس وغیرہ۔ کتاب وسنت کی رو سے حلال اور جائز قرار دیتا ہے۔ **استغفر اللہ العلی العظیم۔**

امر بالمعروف کے سلسلہ میں برسر اقتدار حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ عائلی قانون ہے،

جو ملک کے ہر مسلک وفکر کے علماء کی تصریحات کے مطابق قطعاً کتاب وسنت کے خلاف اور کھلی ہوئی ''مداخلت فی الدین'' (دین میں رخنہ اندازی) ہے، مگر برسر اقتدار حکومت نے علماءِ امت کے علانیہ احتجاج کے باوجود ایک آرڈیننس کے ذریعہ اسلامی عائلی قانون کے نام سے اسے ملک پر مسلط کررکھا ہے اور پیہم احتجاج اور مسلسل وعدوں کے باوجود اس کو منسوخ کرنے یا اس میں ترمیم کرکے شریعت کے مطابق وموافق بنانے پر کسی قیمت آمادہ نہیں ہے، حتی کہ اب ملک کی مذہبی جماعتیں کچھ بعید نہیں ہے کہ اس غیر اسلامی قانون کے خلاف منظم طور پر قانون شکنی شروع کردیں- جیسا کہ ''جمعیت العلماء'' کے حالیہ اجلاسِ سرگودھا کی کارروائی اور پاس شدہ قرارداد سے ظاہر ہوتا ہے- اور اس طرح ملک کا نظم درہم وبرہم ہو، جس کی ذمہ داری قطعاً برسر اقتدار حکومت کی ضد اور ہٹ دھرمی پر ہوگی، یہ ہے برسر اقتدار حکومت اور اس کے حکمرانوں کا کردار ''امر بالمعروف'' کے سلسلہ میں۔

۴...... نہی عن المنکر (شرعاً ممنوع اور حرام کاموں سے روکنا)

اسلامی حکومت کا چوتھا شعار اور مسلمان حکمرانوں کا نمبر چار کردار قرآن عزیز کی تصریحات کی روشنی میں ''نہی عن المنکر'' ہے۔ ملک سے ہر طرح کی شرعی، سماجی اور اخلاقی بدکرداریوں کے انسداد اور قلع وقمع کرنے کا واحد مؤثر ذریعہ بھی صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ملک کا حکمران اور برسر اقتدار طبقہ اپنی بیرونِ خانہ اور درونِ خانہ نجی زندگی کو ان تمام شرعی، سماجی اور اخلاقی برائیوں، بدکرداریوں، بے عنوانیوں سے اس طرح پاک وصاف اور بے داغ بنائے کہ نہ صرف پبلک پر، بلکہ ان کے ماتحت عملہ پر، اہل خانہ پر، دوست احباب اور قریب تر حلقہ پر ان کی پاک دامنی، بے لوثی اور ان تمام بدکرداریوں سے نفرت وبیزاری، بلکہ عداوت ودشمنی آفتاب نیمروز کی طرح روشن اور عیاں ہوجائے، جن کے ملک سے انسداد کے لئے وہ پروگرام اور قوانین بناتے ہیں اور ملک سے ان کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں یہاں تک کہ ان تمام حلقوں کو یقین ہو کہ ہمارے انتہائی قرب کے باوجود ہم کو بھی کسی قیمت پر نہیں بخشیں گے، بلکہ انتہائی تشدد اور بے رحمی کے ساتھ غیروں کے مقابلہ پر ہمارے ساتھ سخت ترین قانونی کارروائی کریں گے۔

ہمارے سب سے بڑی اور خطرناک غفلت - جس کی وجہ سے انسداد وجرائم اور ملک سے قانونی، اخلاقی اور سماجی بدکرداریوں کی بیخ کنی کی تمام تر کوششیں ناکام ہورہی ہیں - یہ ہے کہ ہم جن بدکرداریوں، بے عنانیوں اور جرائم کے انسداد کے لئے قانون بناتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں، وہ خود ہمارے آغوش میں، ہمارے گھروں میں، ہمارے قریب تر حلقوں میں، ہمارے گرد وپیش میں، ہمارے زیر سایہ پھلتے پھولتے اور نشو ونما پاتے رہتے ہیں، ہماری ذات اور ہماری اس نسبت اور قرب کی وجہ سے یہ بدکردار لوگ قانون کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں، ہم دوسروں کے

اعمال پر احتساب کرتے ہیں، مگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کبھی نہیں دیکھتے، دوسروں کی آنکھ کا تنکا ہمیں نظر آتا ہے، مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

بہر حال حکمران طبقہ کی ان ''شرعی'' نہ سہی قانونی، سماجی، اخلاقی بدکرداریوں اور جرائم کے انسداد کی انتھک کوششوں اور سخت سے سخت قوانین نافذ کرنے کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں شراب نوشی، قمار بازی، باہمی رضامندی سے زناکاری، سودخوری، رشوت ستانی، چور بازاری، (شرعاً) حلال وحرام اور (قانوناً) جائز وناجائز کا امتیاز کئے بغیر نفع اندوزی، دھوکہ دہی، جعلسازی وغیرہ بدکرداریاں اس قدر عام ہیں کہ یورپین ممالک بھی اس کے سامنے شرماتے ہیں، رقص وسرود (ناچنا گانا) نیم عریانی، فحش لٹریچر، عورتوں اور مردوں، لڑکوں اور لڑکیوں کا بے محابا اختلاط وارتباط، پاکستانی ثقافت کا طرۂ امتیاز بنتا جارہا ہے، نہ صرف یہ کہ حکومت کی جانب سے اس ''ثقافت'' کی سرپرستی کی جاتی ہے، بلکہ تعلیمی اداروں یعنی یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں کے اس ثقافت کے مظاہروں میں حصہ لینے پر ہر ممکن طریق پر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اخبارات میں ایسے تفریحی پروگراموں کی رودادیں اور ان میں حصہ لینے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے فوٹو نہایت آب وتاب سے شائع کئے جاتے ہیں۔ فلم سازی اور سینما کو پاکستان کی ''انڈسٹری'' میں خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے فروغ کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم ہے، پاکستانی اخبارات کے صفحات اس صنعتِ فلمسازی کی ترقیات کے پروپیگنڈے کے لئے وقف ہیں، فلموں میں کام کرنے والے نوبنو جوانوں، لڑکے اور لڑکیوں -فلمی اصطلاح میں نئے چہروں- کی ہر طرح ہمت افزائی اور پشت پناہی کی جاتی ہے، حالانکہ وہ عموماً اپنے والدین اور سرپرستوں کی بغاوت کر کے، بلکہ بھاگ کر محض ایکٹر یا ایکٹرس بننے کے شوق میں اندھے ہو کر اپنی پوری زندگی اور اسی کے ساتھ خاندانی شرافت کو برباد کر لیتے ہیں، اس کے جاننے کے باوجود ''فلمی حلقہ'' کو ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے کی کھلی چھٹی حاصل ہے۔

انہی ''فواحش'' اور ''منکرات'' کی اشاعت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں جرائم -قتل وغارت، ڈاکہ زنی، چوری، جیب تراشی، دھوکہ دہی، جعلسازی اور شادی شدہ وغیر شادی شدہ عورتوں کا اغوا یعنی فرار وغیرہ جرائم کی تعداد میں اس قدر تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے کہ حکومت کی پوری مشنری اس میں کمی کرنے سے عاجز ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ یہی ہے کہ حکومت ملک کے اندر ''شرعی'' حدود اور ''تعزیرات'' نافذ کرنے سے کسی نامعلوم خوف یا مرعوبیت کی وجہ سے گریز کر رہی ہے۔ جرائم کی مروجہ سزائیں

اس قدر ہلکی اور قانون کی گرفت اس قدر ڈھیلی ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے مجرم بجائے ان جرائم سے باز آنے کے سزا کاٹنے کے بعد اور زیادہ دلیر ہوکر نکلتے ہیں اسی کے نتیجہ میں ملک کے اندر ایک مستقل طبقہ ''جرائم پیشہ'' لوگوں کا پیدا ہو رہا ہے جو ہر ملک، قوم اور حکومت کی پیشانی کا بدترین داغ ہے۔ یہ ہے چوتھے فریضہ نہی عن المنکر کا عالم

خدا فراموشی

بہر حال مجموعی طور پر پاکستان کی حکومت، حکمران، برسرِ اقتدار طبقہ، نیز سرمایہ دار، تاجر، صنعتکار، ہنر پیشہ، ملازمت پیشہ طبقے اور عام پبلک درحقیقت خدا کے خوف، آخرت کے خوف کو اور پاداش عمل کو بالکل بھول چکے ہیں، حرام وحلال، جائز وناجائز کے فرق کو اور شریعت کے احکام کو قطعاً پس پشت ڈال کر حاکم سے لے کر محکوم تک اور راعی سے لے کر رعایا تک سب پر ''خدا پرستی'' کے بجائے ''غرض پرستی'' اس قدر مسلط ہے کہ پوری قوم اپنی نفسانی خواہشات، شخصی اغراض اور ذاتی منافع کے حاصل کرنے میں سرتا پا منہمک ہے۔ اللہ کا، رسول کا، دین اسلام کا، شریعت کا نام جو کبھی کبھار ضمیر کی ملامت کی وجہ سے زبان پر آجاتا ہے اور دین کے گنے چنے شعائر- روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر جو عمل کر لیتے ہیں، وہ صرف خود فریبی اور طفل تسلی کے طور پر یا عادت کے طور پر ایک رسمی سی چیز ہے، الا ماشاء اللہ۔ ملک کے عوام اور متوسط طبقہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو واقعی خدا کا خوف اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا صحیح اور سچا جذبہ رکھتے ہیں اور حتی الامکان ''منکرات'' و''منہیات'' اور''محرمات'' سے اجتناب کرتے ہیں اور انہی کے دم قدم سے یہ ملک اور حکومت قائم ہے۔

جو چیزیں بحیثیت مجموعی قوم کی اس خدا فراموشی اور غفلت کو مستحکم کر کے (العیاذ باللہ) ''ختم اللّٰہ علی قلوبهم'' کی حد تک پہنچا دینے کا سبب بن رہی ہیں، وہ مادی اور معاشی ترقیات اور بڑی حد تک غیروں کے بل بوتے پر قائم ''خود ساختہ'' ترقیاتی منصوبوں کی کامیابیاں ہیں جن پر صدر مملکت اور ارا کین سلطنت سے لے کر ہر روزانہ اخبار تک فخر ومسرت کے راگ الاپنے میں مصروف ہے اور ان دنیوی کامرانیوں کو برسراقتدار حکومت اور صدر مملکت کا زریں اور قابل فخر کارنامہ قرار دے رہے ہیں، حالانکہ شدید اندیشہ اور خطرہ اس امر کا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس خدا فراموشی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے صریحی انحراف کی حالت میں یہ تمام کامیابیاں (خاکم بدہن) کہیں ''فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ'' کا مصداق اور ہماری یہ خوشیاں ''حتی اذا فرحوبها'' کا مصداق نہ ہوں، العیاذ باللہ۔

یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت اور اللہ کے ''پسندیدہ دین'' اور محبوب رب العالمین فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ''شریعت'' کی پیروی کے ساتھ ساتھ جو دنیوی ترقی، مادی خوشحالی اور ملکی رفاہیت حاصل ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ اور اس کی رضا اور خوشنودی کی علامت اور مقام شکر ومسرت ہے اور اس آیت کریمہ کا مصداق ہے: ''لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ''۔

اور جس قدر ہم اس نعمت کا شکریہ، یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ترقی، استقلال اور پائیداری اختیار کریں گے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے خزانے سے ہمارے تصور اور حوصلہ سے بھی زیادہ معاشی رفاہیت، مادی خوشحالی، مال ودولت کی بے پناہ فراوانی اور ترقیات وفتوحات کے دروازے ہم پر کھول دیں گے اور ہر لحاظ سے ملک وملت اور حکومت وسلطنت کو استقلال واستحکام عطا فرمائیں گے۔مسلمانوں کا شاندار ماضی - پہلی اور دوسری صدی کا زریں عہد - اس کا شاہد ہے۔

بہرحال ہمارا ملک کے تمام اعلیٰ وادنیٰ طبقوں کا، حکومت کا اور برسراقتدار حکمران طبقہ کا فرض ہے کہ ہم جلد از جلد اپنے کردار کو قرآن عظیم کے بیان کردہ مومنین کے کردار کے مطابق بنالیں اور اس موجودہ غفلت اور ''خدا فراموشی'' کو اولین فرصت میں ترک کرکے فرائض چہارگانہ: ''اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کو اپنا اور اپنی حکومت کا شعار بنالیں، اس سے پہلے کہ ہم ''خدائی پکڑ'' میں گرفتار ہوں اور دنیا کے دوسرے مسلمان ملکوں کے آئے دن کے خونریز انقلابات، برسراقتدار حکومتوں اور حکمرانوں کے خلاف خوفناک سازشوں، اور رات رات میں حکومتوں کے تختے الٹنے کے واقعات سے عبرت حاصل کریں کہ ان مسلمان ملکوں اور حکومتوں کا عدم استحکام قرآن کریم کی تصریحات ''حَتّٰى إِذَا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا'' کی روشنی میں اسی ''خدا فراموشی'' کا نتیجہ ہے اور یہ انقلابات ہی خدا کی ''ناگہانی پکڑ'' کا مصداق ہیں، اللہ ہم کو، ہمارے حکمرانوں کو، ملک اور قوم کے تمام طبقوں اور حلقوں کو خدا کے پسندیدہ دین ''اسلام'' اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ''شریعت پر پختگی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

☆☆...☆☆

کاروانِ بنوری ٹاؤن کی متاعِ عزیز

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
استاذِ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کا سوانحی خاکہ

۱۹۶۰ء ۶؍اگست کو بابوزئی مردان میں محترم جناب الحاج مشفق الرحمٰن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ سے نوازتے ہوئے ایک فرزندِ ارجمند عطا فرمایا، اس رحمت خاصہ کے شکر وامتنان میں اس نومولود کا نام ''عطاء الرحمٰن'' رکھا گیا۔

۴-۱۹۶۳ء کو ۳،۴ سال کی عمر میں گہوارۂ مادر سے گہوارۂ علم میں آنا جانا شروع کیا، خاندان اور گھرانے کی دینی روایت کے مطابق محلّہ کی مسجد میں اپنے والد گرامی اور دادا جان سے قاعدہ، ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۶۴ء میں گھر سے ذرا فاصلہ پر واقع اسکول میں داخل ہوئے، اسکول میں بھی گھر کا دینی اثر نمایاں رہا، اسکول کی تمام دینی سرگرمیوں میں سب سے آگے آگے رہے، بلکہ تلاوت، نعت یا نظم اور نماز تک تمام دینی امور کی ذمہ داری تکوینی طور پر آپ کے حصے میں رہی۔ یہ سلسلہ ہائی اسکول کے زمانے تک جاری رہا، بلکہ اس کے ساتھ خاندانی خداداد قابلیت ولیاقت کی بناء پر دیگر تعلیمی سرگرمیوں کا نمایاں مقام بھی آپ کے لئے خاص رہا۔

۱۹۷۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بابوزئی سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازاں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے تک عصری تعلیم پرائیویٹ حیثیت میں حاصل کی، انگریزی اور جدید تعلیم کے حامل ہونے کے باجود الحمد للہ! انگریزیت اور جدیدیت کی آلودگی سے پاک صاف رہے جو اکابر جامعہ کی کرامت اور آپ کی گھریلو دینی تربیت کا اثر تھا۔

۱۹۷۷ء میں اپنے دادا جان حضرت مولانا عبد السبحان عرف باباجی رحمہ اللہ، فاضل سہارنپور کی ہدایت اور اپنے والدین ماجدین کی دینی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے علاقہ

کے ایک نامی گرامی عالم دین حضرت مولانا امین گل صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس درس نظامی کا آغاز کرنے کے لئے دارالعلوم شیر گڑھ مردان میں داخلہ لیا، ابتدائی درجات وہاں پڑھنے کے بعد کراچی کا رخ کیا، جس میں دارالعلوم شیر گڑھ کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب دامت برکاتہم کی رائے اور مشورہ بھی شامل تھا، انہوں نے آپ کے دادا جان کی دارالعلوم شیر گڑھ آمد پر مشورہ دیا کہ یہ بچہ بہت ذہین ہے اسے کراچی کا تعلیمی ماحول ملنا چاہئے۔

۱۹۷۸ء میں اپنے دادا جان کی خصوصی ہدایت وخواہش اور اپنے اساتذہ کے مشوروں کے مطابق حضرت بنوری رحمہ اللہ کے شجرۂ علمیہ سے خوشہ چینی کی غرض سے کراچی کے لئے عازم سفر ہوئے۔

۱۳۹۸ھ شوال المکرّم سے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن حال جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں درجہ ثالثہ میں داخل ہوئے اور اس کے بعد درس نظامی کا مکمل نصاب یہیں پورا فرمایا۔

۱۹۷۹ء کو آپ درجہ رابعہ کا امتحان دے کر گھر گئے اور اولاد میں بڑے ہونے کی بناء پر بڑوں نے آپ کی شادی خانہ آبادی کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ آپ کے گھرانے کی لائق تقلید روایت کے مطابق نہایت سادگی کے ساتھ آپ کی ایک پھوپھی صاحبہ (مولانا انعام اللہ صاحب مدظلہ کی والدہ مرحومہ) کے ہاں آپ کی شادی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس سادہ اور بے تکلف شادی کو ''أعظم النکاح برکۃً أیسرھا مؤنۃ'' کا مصداق بنایا۔

آپ کی اہلیہ محترمہ، ہماری استانی صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے صبر، شکر، حوصلہ و ہمت، کفایت شعاری، خدا ترسی اور پارسائی کے اعلیٰ اوصاف کی مالکہ بنایا ہے، جس کا واضح اثر آپ کی اولاد کے کردار و عمل میں محسوس ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عطاء رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر جب انہیں ملی تو انہوں نے نسوانی فطری کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آہ وبکا اور جزع وفزع کے بجائے باوضو ہوکر مصلی بچھایا اور انتہائی صبر وتحمل کے ساتھ نماز، دعا اور تلاوت میں مصروف ہوگئیں، جب کہ اس سخت مرحلے میں بڑے بڑے حوصلہ مند مردوں کے ضبط بھی ٹوٹ جایا کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری استانی صاحبہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ''الصبر عند الصدمۃ الأولیٰ'' کا عملی مصداق بننے کا اعزاز بخشا۔ دکھ درد کی دنیا میں یہ اعزاز شاید ہی کسی ماں، بہن یا بیٹی کو نصیب ہوا ہو۔ یہ اعزاز طبعی و وہبی بھی ہوسکتا ہے، مگر اسے اس عملی تربیت کا نتیجہ بھی کہا جاسکتا ہے جس کا مجسم نمونہ اسی (۸۰) سالہ ضعیف العمر صاحب فراش بزرگ والد کی صورت میں ان کے گھر میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی اور عافیت سے نوازے۔ آمین

۱۹۸۳ء ۱۱/اپریل کو آپ کے ہاں پہلے صاحبزادے کی ولادت ہوئی، جن کا نام مسیح

الرحمٰن رکھا گیا، جو جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل ومتخصص ہیں، مولانا مسیح الرحمٰن جب فاضل ہوئے تھے، اس وقت حضرت استاذ محترم، ناظم تعلیمات اور استاذ الحدیث تھے۔ مسیح الرحمٰن صاحب دورے کے بعد تخصص کرنا چاہتے تھے، مگر ساتھ ہی بیرون ملک کسی اسلامی یونیورسٹی میں داخلے کے لئے کاغذات بھی بھیج چکے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر باہر داخلہ ہوگیا تو تخصص چھوڑ کر باہر چلے جائیں گے، ورنہ تخصص مکمل کرلیں گے، انتظار میں سال ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ مسیح نے اس رائے پر اپنے دادا جان سے تائید بھی لے لی تھی، مگر جامعہ کے ضابطہ کے مطابق اس طرح کرنا معیوب ہی نہیں، ممنوع بھی تھا، اس لئے ناظم تعلیمات صاحب نے اپنے بیٹے کے مقابلے میں جامعہ کے ضابطہ کا پاس رکھتے ہوئے بڑی سختی سے انہیں منع کردیا اور فرمایا کہ جامعہ کو''انتظار گاہ'' کے طور پر استعمال کرنا میرے نزدیک جرم ہے، میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے مسیح الرحمٰن کا بیرون ملک جانے کا پروگرام نہ بن سکا، ادھر جامعہ میں تخصص کے داخلہ کا مقررہ وقت بھی گزر چکا تھا، اس لئے اس سال حضرت ناظم تعلیمات صاحب کے صاحبزادے تخصص میں داخلہ سے محروم ہوئے اور اگلے سال تک گھر بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا، مجھے یقین بلکہ مشاہدہ بھی ہے کہ اگر یہ معمولی تاخیر کسی اور استاذ کے صاحبزادے سے ہوتی، یا مسیح الرحمٰن کی جگہ اس جیسا شریف وخلیق کوئی بھی غیر معروف اور بے تعلق طالب علم ہوتا تو حضرت ناظم تعلیمات صاحب اس کے لئے للہ فی اللہ سفارشی ہوتے اور اسے اپنے اختیارات کے ذریعہ نہیں، بلکہ سفارش کے ذریعہ تخصص میں داخلہ دلوادیتے، مگر مسیح الرحمٰن کے بارے میں''شطر کلمہ'' بھی زبان پر نہ لائے، آپ کا یہ طرز عمل ایک ضابطۂ حیات کا نتیجہ تھا، وہ یہ کہ آپ نے اپنی صاف شفاف عملی زندگی کو کبھی''اقربا پروری'' کی ہوا نہیں لگنے دی، ''اقربا پروری'' سے دوری اور خودداری حضرت استاذ محترم کے نمایاں اوصاف تھے، آپ کے ان دو اصولوں کا واضح اور نمایاں اثر آپ کی اولاد کے رہن سہن، رویوں اور برتاؤ سے بھی جھلکتا ہے، جامعہ کی عملی زندگی میں ہم نے آپ کے بچوں کو اس احساس سے ہمیشہ خالی بلکہ کوسوں دور پایا کہ وہ ہمارے کسی بڑے ذمہ دار یا استاذ کے صاحبزادے ہیں۔ ادب واحترام، اخلاق ومروت اور شرم وحیاء میں حضرت استاذ محترم کی اولاد خاندانی شرافت کی آئینہ دار ہے۔ ہم دعا اور آرزو کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمام اساتذہ کے بچوں کو ادب واحترام، نیکی وصلاح اور اخلاق ومروت میں حضرت الشیخ مولانا عطاء الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بچوں کی طرح بنادے۔......آمین

۱۹۸۶ء ۲۸ رجنوری کو حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادے فصیح الرحمٰن کی ولادت ہوئی، جو گذشتہ سال (۱۴۳۲ھ) دورہ حدیث کے سالانہ امتحان میں وفاق المدارس میں اول آئے ہیں، اس وقت وہ درجہ تخصصِ فقہِ اسلامی سال اول میں زیر تعلیم ہیں، ان کا تعارف،

ان کی تعلیمی و عملی کارکردگی ہے، میں بحیثیت استاذ اور سخت گیر منتظم، الحمد للہ فصیح الرحمن سے مطمئن اور خوش ہوں، اس سے زیادہ کچھ کہنا فی الحال مناسب نہیں ہے۔

۱۹۹۱ء ۵/ جنوری کو حضرت استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی، جن کا نام جمیل الرحمن رکھا گیا، وہ اس وقت درجہ خامسہ میں زیر تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی اپنے بھائیوں کی طرح کامیاب طالب علم اور کامران فاضل بنائے......آمین

۱۹۹۵ء ۲۸/ ستمبر کو حضرت استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چوتھے بیٹے ملیح الرحمن کی پیدائش ہوئی، جو گذشتہ سال حفظ قرآن کریم مکمل کرنے کے بعد اس وقت درجہ اولیٰ میں زیر تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے تعلیمی مراحل بحسن وخوبی مکمل فرمائے اور انہیں اعلیٰ کامیابیوں سے ہم کنار فرمائے......آمین

۱۹۸۳ء - ۱۴۰۳ھ میں حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ سے فراغت کی فضیلت، فاضلانہ حیثیت سے حاصل فرمائی اور اپنی بہترین تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر اپنے مشائخ کے منظورِ نظر ثابت ہوئے۔ آپ کے نامور اساتذہ میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی، حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن، حضرت مولانا محمد سواتی، مولانا بدیع الزمان، حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید، مولانا سید مصباح اللہ شاہ، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید، حضرت مولانا عبدالقیوم رحمہم اللہ اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، حضرت مولانا رضاء الحق، حضرت مولانا محمد انور بدخشانی ادام اللہ فیوضہم جیسے جبال العلم شامل ہیں۔

۱۹۸۴ء - ۱۴۰۴ھ کو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ سے تخصص فقہِ اسلامی کا کورس پڑھا، علم حدیث کی طرح علم فقہ وفتویٰ میں بھی حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی وفنی مہارتوں کو اپنے اندر جذب کرنے میں کامیاب رہے اور عرصہ تک حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے زیر نگرانی دار الافتاء میں فتویٰ نویسی کا کام انجام دیتے رہے، حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ عقیدت ومحبت کا سرمایۂ گراں مایہ بھی خوب خوب سمیٹا، یہاں تک کہ آپ کے علوم وفنون کے علاوہ آپ کی عادات اور اداؤں کا گہرا عکس بھی اپنے ساتھ لے لیا، جس سے زندگی بھر خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور اپنے تلامذہ کو بھی محظوظ فرماتے رہے۔

تخصص کے تعلیمی دورانیہ کے اختتام پر اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوئے، مگر اپنے مشائخ کی نگاہِ انتخاب کے سامنے ہی رہے، چنانچہ اس گوہر نایاب کو جامعہ کے علمی وتدریسی افق پر درخشاں ستارہ محسوس کرتے ہوئے اکابر نے جامعہ میں آپ کے تقرر کا غائبانہ فیصلہ صادر فرمایا اور بذریعہ خط اس کی اطلاع آپ کو بھجوائی گئی، اکابر کے فیصلے بلکہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اگلے تعلیمی سال میں واپس جامعہ آئے۔

۱۹۸۵ء/ ۱۴۰۵ھ کو ابتدائی مشورے کے مطابق آپ کا تقرر جامعہ کی پہلی اور قدیم شاخ مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر سہراب گوٹھ کے لئے ہوا، مگر اس پر عمل سے پہلے ہی اکابر کو یہ توارد ہوا کہ یہ ''عطاء خداوندی'' شاخ سے زیادہ مرکز کے لئے سجتی اور جچتی ہے، یہ توارد مستقبل اور غیب کا علم رکھنے والے کی طرف سے گویا الہام تھا کہ مرکز (بنوری ٹاؤن) کو آگے چل کر مرکزیت کے حامل ایسے چہروں کی ضرورت ہوگی، چنانچہ شیخ عطاء رحمہ اللہ جس سج دھج سے اس مرکز علم وعرفان کا مرکز و محور بن کے رہے، وہ آفتابِ نیمروز کی مانند آسمانِ علم پر ثبت ہے۔

بہرحال آپ نے تدریس اور انتظام کی بعض ذمہ داریوں کے ساتھ جامعہ میں عملی زندگی کا آغاز فرمایا، اعدادیات سے لیکر دورہ حدیث تک درس نظامی کے مختلف علوم اور فنون، کمال مہارت اور عمدہ محنت سے پڑھائے، تدریس کے منفرد جاذب انداز اور حاذق ونباض منتظم ہونے کی بنا پر ہر دور میں اپنے اکابر ومشائخ کے منظور نظر اور معتمد خاص رہے، اسی بناء پر شروع ہی سے آپ جامعہ کی مجلس تعلیمی کے فعال رکن کے طور پر جامعہ کے تعلیمی نظم میں دخیل رہے اور اپنے مشائخ کے دست وبازو بنے رہے۔

۱۹۸۸ء میں شہر کے مرکزی مقام صدر کی جامع مسجد صالح میں آپ کا بحیثیت امام وخطیب تقرر ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جامعہ کی طرف سے منتظمین کے لئے بیرون جامعہ کسی قسم کی مصروفیت اختیار کرنا سخت ممنوع تھا، مگر آپ کا انتخاب اور تقرر اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمایا تھا، چنانچہ اس امامت وخطابت کے باوجود آپ جامعہ کی طرف سے اپنی مفوضہ انتظامی ذمہ داریوں اور تدریس کے لئے ہمیشہ پابندی کے ساتھ پہنچتے رہے، اور اب تک یہ ساری آمد ورفت بالعموم لوکل بس کے ذریعہ رہی، گذشتہ چند سالوں سے آپ کے بعض خاص خدام طلباء پھر فضلاء کبھی کبھی موٹر سائیکل پر لانے لے جانے کی خدمت انجام دیدیا کرتے تھے، جن میں آپ کے دنیوی واُخروی ہم سفر مولانا محمد عرفان شہیدؒ کے علاوہ مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا سہیل یوسف صاحب خصوصی اعزاز یافتہ ہیں۔

۱۹۹۸ء صالح مسجد میں اسکول وکالج کے طلباء کے لئے گرمیوں کی چھٹیوں میں چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس کی بنیاد رکھی، جو محدود عرصہ میں شہر کراچی پھر ملک کے مختلف شہروں اور پھر بیرون ملک تک پھیل گیا۔ یہ کورس اپنی افادیت کے علاوہ حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص وللّٰہیت کا مظہر بھی ہے۔

۱۹۹۹ء- ۱۴۱۹ھ کو جامعہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور اپنے دوراندیشانہ مشوروں سے جامعہ کی علمی وروحانی ترقی میں اپنا وافر حصہ ملاتے رہے۔

۲۰۰۵ء- ۱۴۲۵ھ حضرت مولانا عبدالقیوم چترالی نور اللہ مرقدہٗ کی مستقل علالت کے بعد

جامعہ کی مجلس شوریٰ نے زبردست اصرار کے ساتھ آپ کو جامعہ کے ناظم تعلیمات کے عہدہ کے لئے منتخب کیا، زبردست اصرار کی نوبت اس لئے آئی کہ لفظ عہدہ اور منصب آپ کے مزاج پر کوہِ گراں ہوتا تھا، انہیں بغیر عہدہ اور نام کے کام کرنا ایسے ہی پسند تھا جیسے عام لوگوں کو بغیر کام کے عہدہ اور نام پسند ہوا کرتا ہے۔ بہر حال مجلس شوریٰ کے فیصلے اور حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہم کے شدید تاکیدی حکم کے سامنے آپ نے سرِ تسلیم خم کیا اور ناظم تعلیمات کے طور پر فرائض انجام دینا شروع کر دیئے، اب اگلا مسئلہ یہ تھا کہ آپ کے مزاج کے مطابق، مفوضہ امور کسی مخصوص نشست کے بغیر بھی انجام دیئے جا سکتے ہیں، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک ناظم تعلیمات کے لئے مقررہ نشست پر بیٹھنے کے لئے رضامند نہ ہوتے تھے، کیوں کہ اس وقت مولانا عبدالقیوم رحمہ اللہ شدید علالت کے باوجود بقیدِ حیات تھے۔

حتیٰ کہ بسا اوقات حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہم استاذ کے روپ میں جا کر بیٹھنے کے لئے فرماتے تو امتثالِ امر کے لئے کچھ دیر بیٹھ جاتے، پھر حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب کی خوشی اور دلجوئی کے لئے حضرت ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں کچھ دیر بیٹھتے اور قریبی احباب سے فرماتے کہ ''میں یہاں بیٹھتا ہوں تاکہ حضرت ڈاکٹر صاحب خوش ہوں'' بعد میں اس سے آسان تدبیر یہ اختیار کی کہ جب بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں دفتر تشریف لاتے تو سیدھے حضرت ڈاکٹر صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ جاتے، کچھ دیر راز و نیاز بھری گفتگو ہوتی اور گھنٹہ شروع ہونے پر اجازت لے کر گھنٹے میں چلے جاتے۔

۲۰۰۵ء/ ۱۴۲۶ھ میں حضرت الشیخ الشامزی شہید رحمہ اللہ کی شہادت باسعادت کے بعد دورہ حدیث کا درسی خلا پر کرنے کے لئے مجلس تعلیمی نے حضرت الاستاذ مولانا عطاء الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ کا انتخاب فرمایا، اتفاق کی بات ہے کہ حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے خلا کو پر کرنے کے لئے جب حضرت شامزی شہید رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا تھا تو آپ کو بھی دورہ حدیث میں صحیح مسلم کا سبق دیا گیا تھا اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے بعد حضرت شیخ عطاء الرحمن رحمہ اللہ نے دورہ حدیث کے اسباق کا آغاز بھی اسی صحیح مسلم سے فرمایا، جو آپ کا حدیث شریف کا مستقل سبق تھا، اس کے علاوہ بعض مشائخ حدیث کی غیر موجودگی میں ان کے اسباق بھی پڑھاتے رہے، علاوہ ازیں جامعہ کے شعبہ بنات میں صحیح بخاری شریف کا سبق بھی آپ کے زیر درس تھا۔ بلا شبہ آپ کہنہ مشق استاذ اور لائق و فائق مدرس تھے۔ گوناگوں انتظامی مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود بڑے شغف کے ساتھ سبق میں جاتے، مدرسہ میں ہوتے ہوئے کبھی سبق کا ناغہ نہ فرماتے۔

۲۰۱۲ء/ ۱۴۳۳ھ رواں تعلیمی سال میں پچھلے کچھ عرصہ میں اتفاق سے متعدد اساتذہ کرام رخصت پر تھے، جن میں درجہ عالیہ اور درجہ عالمیہ کے کئی اساتذہ بھی شامل تھے، حضرت ناظم تعلیمات

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسباق کے علاوہ ان اساتذہ کرام کے اسباق بھی خود پڑھائے، اس سال اتفاق سے مجھے حضرت استاذ محترم کا ارادی اور غیر ارادی طور پر بہت ہی قرب رہا، جامعہ کی مصروف عملی زندگی کے باوجود، دن میں متعدد بار دیر دیر تک ملاقات اور صحبت میسر آتی رہی، میں آپ کے اسباق کی کثرت اور آپ کی ہمت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا، کہ ہم اپنی محدود انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ محدود اسباق کے لئے اتنی پابندی نہیں کر پاتے جتنی کہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنے اسباق کی پابندی فرمارہے ہوتے تھے۔ جب آپ دوسرے اساتذہ کرام کے اسباق پڑھا رہے تھے تو بسا اوقات ایک ہی گھنٹے میں دو دو درسگاہوں میں جانا ہوتا، اس بے پناہ تدریسی مصروفیت کے بارے میں اب یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے محاوروں کے مطابق انسان اپنی اجل قریب آنے پر جلدی جلدی اپنا رزق سمیٹتا ہے، اسی طرح حضرت الشیخ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن نوراللہ مرقدہٗ کی اجل قریب آکر جھانکنے لگی تھی، اس لئے وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی روحانی ذریت میں اضافہ کرتے ہوئے اپنی پیچھے ''علم ینتفع بہ'' کے سلسلۂ خیر، کا خاص تکوینی ہدف، پورا کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ گویا تکوینی معاملہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی باقیات صالحات کے روحانی سلسلے میں جن جن طلباء و طالبات کو شامل کرنا تھا، بہت کم وقت میں اس کے مواقع پیدا ہوئے۔ ایسے تمام طلباء وطالبات اس تکوینی سعادت مندی پر مبارک باد اور حضرت الاستاذ کے داغِ مفارقت پر تعزیت کے مستحق بھی ہیں۔ **فعظم اللہ اجرهم واجرنا واحسن عزاء هم وعزاء نا و اغفرلشيخنا و مرافقيه مغفرة ظاهرة و باطنة لا تغادر ذنباً.**

۲۰۱۲ء ۲۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بروز جمعرات جامعہ کے ششماہی امتحان کے نتائج کے اعلان کا دن تھا، حسب معمول ابتدائی گھنٹے آج بھی پڑھائے، عام طور پر صبح مدرسہ آتے ہوئے اکثر راستے میں ملاقات ہوجایا کرتی تھی، مگر پچھلے کچھ عرصہ سے مجھے بروقت مدرسہ پہنچنے میں دیر سویر ہونے لگی تھی، لیکن حسن اتفاق کہ آج حضرت شیخ رحمہ اللہ، مدرسہ میں داخل ہونے کے لئے دروازے سے داخل ہو ہی رہے تھے کہ میں بھی دروازے پر پہنچ آیا، حسب عادت شفقت بھری دلکش مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا، پھر بعض امور سے متعلق کچھ ارشادات اور کچھ ہدایات دیتے ہوئے جامعہ کے احاطہ میں واقع کلینک تک آئے اور وہاں سے درجہ رابعہ میں ''شرح الجامی'' کا سبق پڑھانے چلے گئے، پڑھا کر واپس آئے تو دوبارہ ملاقات ہوئی، پھر ایک قضیہ کی بابت کچھ ہدایات اور مشورے دیئے، پھر دفتر میں آئے، پھر دارالحدیث چلے گئے، جہاں نتائج کے اعلان کے سلسلے میں اساتذہ کا اجتماع تھا، جاتے ہوئے فرمایا کہ آپ حضرات (چند ذمہ دار اور راقم) یہ قضیہ حل کریں، آپ لوگوں کو اساتذہ کے اجتماع میں آنے کی ضرورت نہیں۔

اساتذہ کے اجتماع سے فارغ ہوکر پھر ایک مشاورتی سلسلے میں جامعہ کے تاریخی مہمان خانہ (جہاں کئی اکابر نے اپنے آخری سفر سے پہلے قیام فرمایا تھا) میں دیر تلک بیٹھے رہے، زیر بحث قضیے کے پس منظر، پیش منظر اور مختلف اطراف و جوانب پر سیر حاصل ناصحانہ گفتگو فرمائی، جس میں ماضی کی کئی یادیں اور مستقبل کے کئی راہ نما اصول پنہاں تھے، پھر یہاں سے گھر کی طرف نکلے، آہستہ آہستہ چلتے رہے، کئی واقعات اور حقائق یوں بتاتے گئے جیسے کوئی انسان پیغام یا امانت پہنچا رہا ہو، جو موضوع باقی تھا اس کو میرے گھر کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے پورا فرمایا، یہ معمول صرف آج کی الوداعی ملاقات کا نہیں، بلکہ سال بھر تقریباً یہی معاملہ رہا، جس کی تفصیل مستقل نشست کی متقاضی ہے۔

میں حضرت استاذ محترم کی ان لمبی لمبی باتوں اور ملاقاتوں کی حکمت سمجھنے کی اب جو کوشش کرتا ہوں تو ان کے سلسلۂ گفتگو کا ایک جملہ معترضہ فوراً سامنے آجاتا ہے ''مولوی صاحب! یہ باتیں جامعہ کی امانت ہیں، آپ لوگوں کو معلوم ہونی چاہئیں''۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی باتیں جامعہ کی امانت ہی نہیں، بلکہ آپ کی طرف سے وصیت بھی تھیں۔ **فإنا لله وإنا إليه راجعون. اَللّٰهم اجعلنا خير خلف لخير سلف.**

۲۰۱۲ء ۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ جمعہ کا دن تھا، جمعہ کا وعظ فرمایا، سامعین کو اجل کی اچانک آمد کی حقیقت سمجھائی اور آخری سفر سے پہلے مختصر سفر کے لئے پابہ رکاب ہوئے، دو نہایت ہی میٹھے رشتے بھی شریک سفر تھے، ایک طرف بہن جیسا مجسم محبت و الفت رشتہ، دوسری طرف جاں فشانی اور جاں نثاری کی چلتی پھرتی تصویر، حقیقی معنوں میں شاگرد اور خادمِ سفر و حضر برادرم مولانا مفتی محمد عرفان حمید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

جامعہ سے سفر پر رخصت ہوتے ہوئے آج خلافِ معمول بے چینی، اضطراب اور حساسیت نمایاں تھی، یہی کیفیت ائیرپورٹ پر اندر جانے کے بعد بھی رہی، جو رخصت کرنے والے باہر بھی محسوس کررہے تھے، شام تقریباً ۵ / بجے جہاز کی روانگی کا مقررہ وقت تھا، نجی ائیرلائن کا ٹکٹ تھا، عام طور پر مقررہ وقت سے تاخیر ایسی ایئر لائنوں کا معمول ہے، مگر آج بھوجا ائیر لائن ۱۲۷ / انسانوں کو اپنے ''مشؤم شکم'' میں چھپاتے ہی مقررہ وقت سے ۵ / منٹ پہلے اڑا اور اٹھارہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی زمینی رفتار سے اسلام آباد کی طرف فضا میں تیرنے لگا، اسلام آباد ائیرپورٹ کی حدود صرف ۹ / منٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھیں کہ بھوجا ائیرلائن گہرے سیاہ بادلوں میں موت سے مقابلہ کرنے لگی، لیکن موت سے موت کے علاوہ کون مقابلہ کرسکتا ہے، آناً فاناً موت کے ایک تھپیڑے نے بھوجا ائیرلائن کو آسمان سے زمین کی طرف لڑھکا دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے: ''**من کان اٰخر کلامه لا إله إلا الله دخل**

الجنة''. ان شاء اللہ! یہ قافلۂ آخرت ''الصادق المصدوق'' صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق سیدھا جنتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشادِ گرامی کے مطابق بلندی سے گر کر یا آگ کی تکلیف سہہ کر جان جانِ آفرین کے سپرد کرنے والے مسلمان، شہداءِ امت ہیں۔اور شہادت ہر مومن کا مقصود ومطلوب ہے، اس لئے ہم سمیت تمام مرحومین کے لواحقین کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات گرامی سرمایۂ تسلی وصبر ہیں، کیوں کہ مومن کا جنت میں پہنچ جانا اور وہ بھی رتبۂ شہادت کے ساتھ یہ اتنی بڑی کامیابی وسعادت مندی ہے کہ اس کے مقابلے میں فطری دکھ درد جتنا زیادہ بھی ہو وہ ہیچ ہے، اس لئے ہم سب کو اپنے مرحومین کے حق میں وہی کلمات کہنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے اور بتائے ہیں، پس ان ارشادات کی روشنی میں ہم یہ دعا کرتے ہیں: ''**اللّٰھم اغفر لشیخنا ومرافقیه، وارفع درجتهم فی المهتدین، واخلفهم فی عقبهم فی الغابرین واغفرلنا ولهم یا رب العٰلمین! وافسح لهم فی قبورهم و نور لهم فیها. آمین**''.

۲۰۱۲ء بروز ہفتہ ۱۲/ بجے دن جامع مسجد فاروق اعظمؓ آئی نائن، اسلام آباد میں حضرت شیخ عطاء الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں مقامی علماء ومشائخ کے علاوہ دور دراز سے آپ کے تلامذہ اور عوام بھی شریک ہوئے، جو ہزاروں کا مجمع تھا، یہاں آپ کی نماز جنازہ قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم نے پڑھائی، پھر آہوں اور سسکیوں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہوا۔کراچی سے پہنچے ہوئے کئی اساتذہ، متعلقین اور سیکڑوں فضلاء وطلباء اپنے محبوب استاذ کے جسد خاکی کے پیچھے پیچھے بوجھل قدموں اور تر آنکھوں کے ساتھ بابوزئی مردان کی طرف روانہ ہوئے، تقریباً شام ۵/ بجے استاذ محترم کے آبائی گاؤں پہنچے، جہاں اسلام آباد کے اجتماع سے کئی گنا بڑا اجتماع موجود تھا، دور دراز سے بڑے بڑے قافلے پرائیویٹ گاڑیوں کے علاوہ ویگنوں اور بسوں میں بھر بھر کر پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے اور یہ سلسلہ مزید جاری تھا۔گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے روڈ اور قریب کے کھیت ناکافی ہورہے تھے، علماء صلحاء طلباء اور عوام کا جم غفیر ایسا کہ تاحد نگاہ انسانی سر بلکہ سفید ٹوپیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں، اس جم غفیر نے ۶/ بجے شام استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب نوراللہ مرقدہ کی نماز جنازہ ادا کی، حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) نے نماز جنازہ کی امامت کروائی اور آج کا سورج غروب ہوتے ہی علم وعمل، شفقت ومحبت اور فدائیت وفنائیت کے پیکر، بزم بنوری کی ایک روشن قندیل کا جسد خاکی اپنے آخری مسکن میں پہنچ کر ہم سے اوجھل ہوگیا اور اپنی پیچھے کئی تاریکیاں اور ان تاریکیوں میں بس اپنی یادوں کے اجالے چھوڑ گیا۔ **فإنَّ لله ما أخذ وله ما أعطى وكل شيء عنده بأجلٍ مسمىً**.

صبحِ وصال (۱۹۷۷ء) تا شبِ ہجر (۲۰۱۲ء)

شیخ عطاءؒ سے رفاقت کی چند جھلکیاں

حضرت مولانا امداد اللہ مدظلہ
ناظم تعلیمات جامعہ بنوری ٹاؤن

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب شہید رحمہ اللہ جو مجھ سے ایک چیز میں چھوٹے اور اس کے علاوہ ہر چیز میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں خاندانی رشتہ میں ان کے والد گرامی کے چھوٹے بھائیوں میں شمار ہوتا ہوں، اس کے علاوہ شیخ عطاءؒ علم وعمل اور عمر و تجربہ میں مجھ سے بڑے تھے، مگر ان کا میرے ساتھ برتاؤ، گہری اخوت، مکمل اعتماد اور بے پناہ محبت واحترام کا برتاؤ تھا۔ اخوت واعتماد اور محبت کا یہ رشتہ یوں تو بچپن کے گھریلو ماحول سے قائم تھا، مگر اس کا حقیقی معنوں میں احساس اور ظہور ۱۹۷۷ء سے شروع ہوکر ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء تک رہا۔ یہ طویل دورانیہ جامعہ میں ہماری تعلیمی زندگی، پھر عملی وابستگی کی حسین یادوں پر مشتمل ہے، جس کا ایک ایک لمحہ یادگار، اس کا ہر ہر دن ایک تاریخ اور اس کی ایک ایک رات داستانِ دراز ہے، ایسے تعلق اور اس تعلق کی یادوں کو مختصر وقت اور محدود صفحات میں سمیٹنا کتنا دشوار ہے، اس کا اندازہ وہی انسان لگا سکتا ہے جو ان مراحل سے گزرا ہو اور گزر رہا ہو، اسی طویل اور گہرے تعلق کی وجہ سے ساتھی بار بار اصرار بھی کررہے ہیں اور کچھ باتیں عرض کرنے پر مجبور کررہے ہیں، اس لئے محض ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی، بلکہ اظہارِ تعزیت وتشکر کے لئے اختصار کے ساتھ چند باتیں ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ذکر کرنے پر اکتفاء کروں گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا کہ شیخ عطاءؒ سے میری جامعہ کی تعلیمی پھر عملی زندگی کا تعلق ۱۹۷۷ء سے شروع ہوتا ہے جو تا شبِ فرقت وہجر بے مثال تسلسل اور توازن کے ساتھ قائم رہا، کسی بھی تعلق کے اس قدر طویل دورانیہ میں فطری طور پر بے شمار نشیب وفراز آتے رہتے ہیں، سخت سے سخت حالات آتے جاتے رہتے ہیں، مگر مجھے یاد نہیں ہے کہ اس طویل عرصہ میں ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی خلش یا رنجش پیدا ہوئی ہو یا ہمیں ایک دوسرے سے اعراض اور ناراضگی کی نوبت آئی ہو، اس کا بنیادی وسیلہ شیخ عطاء مرحوم ومغفور کے اعلیٰ اخلاق اور حسن خلق تھا، جس نے ہمیشہ مجھے متاثر ہی

نہیں بلکہ آپ کے ادب واحترام کے لئے دل وجان سے مجبور بھی کیا۔

اخوت ومحبت کی اس طویل رفاقت میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ہمارے طویل طویل اسفار بھی ہوئے، ان اسفار میں معاملات کی صفائی اور شفافیت کے لئے آپ کا جو حکیمانہ طریقہ تھا وہ میرے لئے بڑا متأثر کن اور قابل تقلید رہا، سفر شروع ہونے پر فرماتے کہ: امداد اللہ صاحب! سفری اخراجات کے لئے آپ امیر اور مختار ہیں، خرچ کرتے رہیں، آخر میں سارا خرچہ برابر تقسیم کرلیا جائے گا، چنانچہ زندگی بھر یہی معمول رہا اور کبھی ایک دوسرے کی طرف کسی قسم کا حساب کتاب نہیں رہنے دیا، معاملات کے اسی شفاف اصول کا نتیجہ ہے یا شاید بعض لوگ حیران بھی ہوں کہ ہم دونوں تعلیمی زندگی کے آغاز سے لے کر عملی زندگی کی شام تک کبھی ایک دوسرے کے مقروض نہیں رہے۔

شیخ عطاءؒ کے معاملات کی شفافیت کا پہلو بڑا منفرد قسم کا رہا، ملک میں مختلف مواقع پر قدرتی آفات سے متأثرین کے لئے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کی طرف سے ہنگامی امداد اور تعاون کی اپیل ہوتی رہی، جس میں ۲۰۰۵ء کا زلزلہ، سیلاب متأثرین اور متأثرینِ سوات و مالاکنڈ وغیرہ شامل ہیں، ان تمام مواقع پر شہر بھر کے علاوہ صدر کراچی کے تاجر حضرات نے بھی دل کھول کر حصہ لیا، ان کا تعاون جامع مسجد صالح صدر کے امام وخطیب ہونے کے ناطے حضرت شیخ عطاءؒ کے توسط سے جامعہ پہنچتا رہا، مگر کبھی آپ نے ان پیسوں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس موجود ساتھیوں کے حوالہ کرواکر سیدھا محاسبِ جامعہ پہنچوادیتے اور وصولی کی رسید ان معاونین تک پہنچوادیتے۔

باہمی اعتماد کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی کوئی قدم ایک دوسرے کے علم میں لائے یا مشاورت کے بغیر نہیں اُٹھاتے تھے، یہ معاملہ گھریلو معمولی مسائل سے لے کر جامعہ کی عملی زندگی کے بڑے بڑے معاملات تک رہتا تھا۔ الحمدللہ! اس مشاورت کی خیر وبرکت ہمیں ہر معاملے میں محسوس ہوئی اور کوئی ایسا معاملہ مجھے یاد نہیں ہے کہ جس میں مشاورت ہوئی ہو اور بعد میں پشیمانی کا سامنا ہوا ہو۔

جامعہ کی طرف سے جب ہمیں گھر ملے اور اہل خانہ کو جامعہ کی رہائش گاہوں میں لانے لگے تو اس سلسلے میں مشاورت کے علاوہ بعض دوراندیشانہ نصائح بھی فرمائے، مجھ سے فرمانے لگے کہ: ''ہم نے بڑی اخوت، محبت، اعتماد اور حسن ظن والی زندگی گزاری ہے، گھروں میں خواتین کے مسائل الجھتے رہتے ہیں، ہمارا پڑوس بھی ہوگا (دونوں گھر آمنے سامنے ہیں) اور خواتین کا باہمی میل جول بھی رہے گا، ہمیں یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ خدانخواستہ عورتوں کے معاملات کی وجہ سے ہماری شیریں رفاقت میں کہیں تلخی نہ آنے پائے''۔ الحمدللہ! گھریلو زندگی میں اس فکر کو ہم دونوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی فکر کے مطابق اپنے بیوی بچوں کی تربیت کی، جس کی بدولت الحمدللہ! ہم اس طویل عرصہ میں سرخرو رہے، ہماری طرح ہمارے بیوی بچوں کے درمیان بھی کبھی کسی قسم کی رنجش یا بدمزگی

محسوس نہیں ہوئی، **فالحمدللّٰہ علی ذلک۔**

شیخ عطاء الرحمٰن شہیدؒ کا مزاج ایک طرف انتہائی نازک اور حساس تھا، مگر دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ ہر معاملے میں جوڑ اور ربط پر زور دیتے تھے، بالخصوص جامعہ اور وفاق المدارس کے قابلِ مشورہ مسائل میں ہمیشہ اپنا وزن اس پلڑے میں ڈالتے تھے جس میں جوڑ اور اجتماعیت کی شکل نکلتی ہو، وفاق کے معاملات میں اگر کوئی معترض بن کر آتا تو اُسے یہی جواب دیتے کہ: ''وفاق'' کیا ہے؟ وفاق ہمارے اور آپ کے مدرسہ کا نام ہے، اس پر اعتراض کی بجائے اپنا مدرسہ سمجھ کر اس کی بہتری اور ترقی کے لئے مفید مشورے اور تجویز دیں، اپنے آپ کو وفاق کا فریق ثابت نہ کریں، بلکہ رفیق ثابت کریں''۔

شیخ عطاءؒ کی یہ گفتگو شہادت والے جمعہ سے پہلے جمعرات کے دن مختلف مواقع پر ہوتی رہی، پھر اسی رات کو تقریباً گیارہ بجے تک جاری، یہ ہماری طویل نشستوں میں آخری نشست تھی، جس میں اتفاق سے وفاق المدارس ہی کے بعض موضوعات زیرِ مشورہ تھے، کیونکہ آپ کے سفری پروگرام میں وفاق کی امتحانی ونصابی کمیٹی میں شرکت بھی شامل تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وفاق المدارس کے حوالہ سے اپنے اس مزاج کے برعکس اعتراضات پر اعتراضات کرنے لگے اور میں وفاق کے دفاع میں دلائل دیتا رہا، گفتگو کے آخر میں فرمانے لگے کہ: میں وفاق پر اعتراض نہیں کر رہا تھا، بلکہ آپ سے ان اعتراضات کے جوابات نکلوانا چاہتا تھا اور میرا مقصد پورا ہوگیا، الحمدللہ! مجھے ''وفاق'' کے حق میں مناسب مواد مل گیا جو برموقع استعمال کرسکوں گا، ان شاءاللہ!۔

بہرحال یہ ان کا بڑا پن اور اجتماعیت آمیز فکر کا مظہر تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ شرفِ اجتماعیت سے نوازے رکھے، آپس میں جوڑ کا ذریعہ بنائے، توڑ کا باعث نہ بنائے۔ آمین

۱۹ اپریل ۲۰۱۲ء کی شب جمعرات کو اسی مجلس کے اختتام پر فرمانے لگے کہ: ''کل میرا چونکہ سفر ہے اور میرے پاس کچھ امانتیں ہیں، مجھ پر ان امانتوں کا سخت بوجھ ہے، آپ وہ وصول کر کے متعلقہ حضرات تک پہنچانے کا انتظام کردینا''۔ چنانچہ ایسا ہی کیا، وہ امانتیں اور ان کی تفصیلات میرے حوالے کرتے ہوئے یہ نشست اختتام پذیر ہوئی، اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تکوین کا معاملہ تھا یا کشف کا نتیجہ کہ شیخ عطاءؒ اس آخری ملاقات میں میری کئی باتوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی کئی امانتوں کا بارِگراں میرے ناتواں کندھوں کے لئے چھوڑ کر مکینِ خُلدِ بریں جا ٹھہرے، **فیغفرہ اللّٰہ ولنا مغفرۃ ظاھرۃ وباطنۃ۔**

شیخ عطاءؒ کی زندگی جس طرح اخوت، محبت اور اعتماد کا مرقع تھی، اسی طرح آپ کی رحلت وشہادت کا تذکرہ بھی آپ کی اخوت ومحبت کے دو ہم سفروں کے بغیر پورا نہیں ہوتا، جب بھی آپ کی شہادت

کی داستان چھڑتی ہے، آپ کے ساتھ آپ کے دنیا وآخرت کے ہم سفر عزیز القدر مولانا مفتی محمد عرفان شہیدؒ اور آپ کی ہمشیرہ محترمہ شہیدہؒ کا تذکرہ بھی ضرور کیا جاتا ہے، یہ تذکرہ صرف تذکرہ کی حد تک نہیں، بلکہ دعاء اور ایصالِ ثواب میں شرکت کے لئے بھی ہے، یہ ان دونوں ہم سفر مرحومین کے شیخ عطاءؒ کے ساتھ تعلق کا اولین ظاہری فائدہ ہے کہ آپ کے سینکڑوں رفقاء ہزاروں شاگرد جب بھی شیخ عطاءؒ کے لئے دعاء وایصال ثواب کریں گے، وہ لازماً آپ کی ہمشیرہ مرحومہ کے بچوں، ساس، سسر، شوہر، بلکہ جملہ خاندان کے لئے اور برادرم عرفان شہیدؒ کے خاندان کے لئے تسلی کا ذریعہ بھی ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر ان دونوں مرحومین کا وقت مقررہ کسی اور بہانے سے شیخ عطاءؒ کے علاوہ پورا ہوجاتا تو شاید اس قدر دعا اور ایصالِ ثواب کا سلسلہ جاری نہ ہوتا، ان دونوں مرحومین کی خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ جو بھی عالم یا طالب علم شیخ عطاءؒ کی قبر پر دعاء اور ایصال کے لئے حاضری دے گا، وہ ان دونوں مرحومین کی قبروں پر بھی ضرور حاضر ہوگا اور ان کی مغفرت اور رفع درجات کی دعاء ضرور کرے گا اور یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہر ذی روح نے مرنا ہے اور مسلمان کو مرنے کے بعد نفع پہنچانے والی چیز یہی دعاء وایصال ثواب ہے، اس لئے ان دونوں مرحومین کے خاندان والوں کو اس جدائی کے فطری رنج والم کے ساتھ اس قابل رشک موت پر اطمینان اور تسلی بھی رکھنی چاہئے، اللہ تعالیٰ ان سب کو صبرِ جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائے، آمین۔

تشکر وامتنان

شیخ عطاء الرحمٰن شہیدؒ کی شہادت کا حادثۂ فاجعہ جس طرح جامعہ کے لئے عظیم سانحہ ہے، اسی طرح طبعی طور پر خاندان کے لئے بھی بہت بڑا صدمہ ہے، اس صدمہ میں دنیا بھر سے مختلف حضرات نے خط وکتابت، فون یا تشریف آوری کے ذریعہ جامعہ کے ساتھ اور خاندان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا، اسی طرح کراچی سے کثیر تعداد میں احباب جنازے میں شرکت کے لئے گئے اور پھر تسلسل کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتے رہے، اسی طرح راولپنڈی، اسلام آباد کے مختلف حضرات جنہوں نے مختلف طریقوں سے ہمدردی کا اظہار فرمایا، اس کے علاوہ ملک کے کونے کونے سے علماء اور احباب نے جامعہ آکر یا ہمارے دور افتادگاؤں آکر اظہارِ تعزیت کیا، میں ان سب کا جامعہ کی طرف سے، اپنی طرف سے اور مولانا مرحوم کے والد بزرگوار کی طرف سے اور پورے خاندان کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دونوں جہانوں میں اس حسنِ اخلاق اور اظہارِ ہمدردی کا اعلیٰ سے اعلیٰ صلہ عنایت فرمائے، آمین، إنَّ اللّٰه لايضيع أجر المحسنين۔

شیخ عطاؑ شہید رحمہ اللہ

مولانا فضل محمد یوسف زئی

استاذِ حدیث جامعہ بنوری ٹاؤن

أَيَا قَبْرَ مَعْنٍ! كَيْفَ وَارَيْتَ جُوْدَهُ
وَقَدْ كَانَ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْبَحْرُ مُتْرَعاً

ترجمہ: ”اے شیخ عطاء کی قبر! تو نے شیخ کے اتنے فضائل کو کیسے چھپالیا؟
حالانکہ شیخ کے فضائل سے برّ و بحر بھرا ہوا چھلکتا تھا“۔

جامعہ پر ایک نظر:

چند سالوں سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن حادثات کی زد میں ہے، جامعہ کو ہر حادثہ کے نتیجے میں اپنی نوعیت کا الگ الگ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ جامعہ کے اساتذہ میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کی تصنیف کے میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی عبدالسمیع صاحبؒ جب شہید کردیئے گئے تو ان کی شہادت کی وجہ سے مسلک حق کے ”دفاع“ کو زبردست نقصان پہنچا، وہ مسلکِ حق کے مدارس ومساجد کے دفاع کے لئے شمشیر بے نیام تھے، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے قلمی، اصلاحی اور روحانی برکات کے میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی شہادت سے مسلک حق کے علمی، تحقیقی، مشاورتی اور تدبیری امور کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان کی شہادت سے مسلک حق کے خدماتی اور رفاہی میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ کی شہادت سے فرق باطلہ کی تشخیص اور ان کی تردید کے میدان کو نقصان پہنچا۔ حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ کی شہادت سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اندرونی وبیرونی انتظام کو نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ دیگر حادثات بھی جامعہ کو پیش آئے، جن سے اپنی نوعیت کے الگ الگ نقصان کو جامعہ نے برداشت کیا۔ ہم ان حادثات پر جتنے درد کا اظہار کریں،

اس میں ہم حق بجانب ہیں، کیونکہ یہ ناقابلِ برداشت حادثات ہیں۔ شاعر ساحر کہتا ہے:

إنْ جَــزِعْــنَــا لَــهُ فَلاَ عَــجَــبَ
ذَالْــجَــزْرِ فِــيْ الْبَــحْــرِ غَيْــرُ مَعْهُوْدِ

ترجمہ: ''اگر ہم ان (شہداء) کے لئے جزع فزع کریں تو یہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ سمندر کی لہروں میں یہ نقصان غیر معمولی نقصان ہے''۔

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ سے میری رفاقت:

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ جامعہ کے اساتذہ کرام آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں۔ میں جامعہ کی تدریس سے ۱۹۸۷ء سے منسلک ہوا ہوں، دو سال میں نے ملیر شاخ میں تدریس کی اور ۱۹۸۹ء میں میرا تبادلہ مرکز کے لئے ہوا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں درجۂ سابعہ کی کلاس میں مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے لئے داخل ہونے لگا تو راستے میں مجھے مولانا عطاء الرحمٰنؒ ملے، آپ نے میری رہنمائی فرمائی اور سابعہ کی کلاس میں بٹھانے کے لئے درسگاہ تک میرے ساتھ آئے۔ آج جب میں گھر سے نکلا تو حضرت مولانا مرحوم کے دو بیٹے جمیل الرحمٰن اور ملیح الرحمٰن مجھے سیڑھیوں پر ملے جو مولانا کے جنازہ پر بابوزئی گئے تھے اور اب واپس گھر آرہے تھے، گھر میں داخل ہونے سے پہلے میری ہی ملاقات ان سے ہوئی، میں نے ان کو ان کے گھر جانے کے لئے جب اشارہ کیا تو مجھ پر رقت طاری ہوئی اور مجھے وہی منظر یاد آیا جو مولانا مرحوم نے ۱۹ شوال ۱۹۸۹ء میں مجھے درسگاہ جانے کے لئے اشارہ کیا تھا، شاعر نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کی عمر ۵۲ سال تھی، گویا وہ عمر میں مجھ سے بارہ سال چھوٹے تھے، لیکن چونکہ وہ میرے پڑوس میں رہتے تھے اور جامعہ کی تدریس میں ہمارے رفیقِ تدریس تھے، اس لئے ہم نے تقریباً ۲۳ سال کا طویل عرصہ اکٹھا گزارا ہے۔ مولانا مرحوم میں احباب و رفقاء کے ساتھ محبت و مروت کا بہت بڑا جذبہ تھا، وہ آپس کے اکرام و احترام کا بہت زیادہ لحاظ رکھتے تھے، ہم ۲۳ سال تک اکٹھے رہے ہیں، اس طویل عرصہ میں ہماری آپس میں کبھی کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ: وہ مرگئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں عارضی زندگی گزار رہے ہیں، ہمارا حقیقی گھر یہاں نہیں ہے، بلکہ یہ تو قید خانہ ہے، اصل گھر تو مسلمان کا وہی ہے، جہاں مولانا مرحوم چلے گئے، کسی نے سچ کہا ہے:

کون کہتا ہے کہ مومن مرگیا
قید سے چھوٹا وہ اپنے گھر گیا

اگر چہ مولانا مرحوم کا یہ جانا اٹل اور مقدر تھا، لیکن جامعہ کے اساتذہ کو مولانا مرحوم کے اس طرح جلدی اٹھ جانے کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ مولانا مرحوم کی عمر بھی اتنی زیادہ نہ تھی، اس لئے ان کے اس سانحۂ شہادت کو اساتذہ وطلبہ حیرت کے ساتھ اس طرح خیال کرتے ہیں، جس طرح شاعر نے کہا:

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حیرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مولانا مرحوم کے پسماندگان:

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے ضعیف والدین، تین بہنیں، تین بھائی، ایک بیوہ اور چار بیٹے سوگوار چھوڑے ہیں، دو بیٹے عالم ہیں اور دو ابھی جامعہ میں ہی زیر تعلیم ہیں۔

مولانا مرحوم کے والد محترم مشفق الرحمٰن صاحب مدظلہ اس وقت عمر کی انتہائی ضعیف حالت میں ہیں، اس طرح نابغۂ روزگار عالم فاضل بیٹے اور بیٹی کا ایک ساتھ اٹھ کر چلا جانا یہ ایسا صدمہ ہے کہ ایک مضبوط اعصاب کا جوان شخص اس کو برداشت نہیں کرسکتا، لیکن اس باہمت باپ نے اس حادثہ کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر تمام بے چینی کے باوجود نہایت صبر واستقلال اور عظمت ووقار کے ساتھ برداشت کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی طرح کے کردار سے تاریخ بنتی ہے۔ تعریف صبر کی ہوتی ہے، بے صبری کی تعریف نہیں کی جاتی۔ میرے خیال میں مولانا امداد اللہ صاحب مدظلہ پر اس صدمے کا بہت زیادہ بوجھ ہے، اللہ تعالیٰ سب کو صبر کی توفیق دے۔ حضرت ابن عباسؓ کے والد حضرت عباسؓ کا جب انتقال ہوا تو ابن عباسؓ کو ایسی بے چینی لاحق ہوگئی کہ کسی کی تسلی دینے سے چین ہی نہیں آرہا تھا، وہ خود فرماتے ہیں کہ: مجھے ایک دیہاتی نے تسلی کے لئے دو شعر سنا دیئے، جس سے میری پوری تسلی ہوگئی اور چین حاصل ہوگیا، وہ دو شعر یہ ہیں:

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ وَإِنَّمَا
صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ

ترجمہ:۔ ''اے ابن عباسؓ! آپ صبر کریں، آپ کے صبر سے ہم بھی صابر بن جائیں گے، کیونکہ بڑوں کے صبر سے چھوٹے صابر بن جاتے ہیں''۔

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ أَجْرُكَ بَعْدَهُ
وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

ترجمہ:۔ ''تجھے جو اجر ملے گا وہ تیرے لئے عباسؓ سے بہتر ہے اور عباسؓ کے لئے اس کا رب تجھ سے زیادہ بہتر ہے۔

صبر کی یہ تلقین صرف مولانا کے پسماندگان کے لئے نہیں ہے، بلکہ حضرت مولانا کی موت کا یہ ہمہ گیر غم جامعہ کے رئیس، اساتذہ، طلبہ اور حضرت مولانا مرحوم کے تمام متعلقین اور ہزاروں

شاگردوں کے لئے مشترکہ غم ہے، لہذا صبر کی یہ تلقین بھی سب کے لئے ہے، کیونکہ مولانا مرحوم کی حادثاتی موت سے ان سب حضرات کی بنیادیں ہل گئی ہیں، کسی نے سچ کہا ہے:

وَمَا هُلْكُ قَيْسٍ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

یعنی شیخ عطاءؒ کی موت کسی ایک انسان کی موت نہیں ہے، بلکہ اس سے پوری قوم کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

میری ساٹھ سال عمر ہے، میں نے اس عمر میں کسی عالم یا غیر عالم کی تعزیت کے لئے دنیا کے مختلف حصوں سے اتنے لوگوں کو آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، جتنا کہ مولانا مرحوم کی تعزیت میں سیلاب کی طرح لوگ اُمنڈ آئے، یہ مولانا کی مقبولیت عند اللہ اور مقبولیت عند الناس کی واضح دلیل ہے۔ بہرحال موت کا راستہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر ہر زندہ انسان کا گزرنا لازم ہے، اگر دنیا میں کسی کا ہمیشہ رہنا اعزاز واکرام ہوتا تو آنحضرت ﷺ پر کبھی موت نہ آتی:

وَلَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَدُوْمُ لِوَاحِدٍ
لَكَانَ مُحَمَّدٌ فِيْهَا مُخَلَّداً

یعنی اگر دنیا میں کسی کو ہمیشہ رہنا ہوتا تو محمد ﷺ ہمیشہ یہاں رہتے۔

موت کا آنا اور ہر ذی جاندار کا اس کو چکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غالب اور قادر مطلق ذات ہے وہی ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' ہے:

أَلا! إِنَّمَا كَانَتْ وَفَاةُ مُحَمَّدٍ
دَلِيْلٌ عَلٰى أَنْ لَّيْسَ لِلّٰهِ غَالِبُ

یعنی محمد ﷺ کی وفات اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی غالب نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ موت کے میدان میں صبر کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، صبر ہی مضبوط ہتھیار ہے۔ ایک عاقل شاعر نے خوب کہا:

سَبِيْلُ الْمَوْتِ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ
فَدَاعِيْهِ لِأَهْلِ الْأَرْضِ دَاعٍ

یعنی موت کا راستہ ہر زندہ انسان کا انجام ہے، اس لئے کسی وقت بھی اس کو زمین سے جانے کے لئے کوئی بلانے والا بلائے گا۔

فَصَبْراً فِيْ مَجَالِ الْمَوْتِ صَبْراً
فَمَا نَيْلُ الْخُلُوْدِ بِمُسْتَطَاعٍ

پس موت کے میدان میں صبر کو اختیار کرنا چاہئے، کیونکہ ہمیشہ زندہ رہنا کسی کی طاقت میں نہیں ہے۔

انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان جانے کے لئے آیا ہے، رہنے کے لئے کوئی نہیں آیا ہے، آنا ترتیب کے ساتھ ہے کہ بڑا پہلے آتا ہے، چھوٹا بعد میں آتا ہے، لیکن جانے میں کوئی ترتیب نہیں ہے، کبھی چھوٹا پہلے جاتا ہے، بڑا بعد میں جاتا ہے، کبھی اس کا عکس ہوتا ہے، اس طرح ہر محبوب اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے اور موت کا علاج کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے:

سُبِقْنَا إِلَى الدُّنْيَا فَلَوْ عَاشَ أَهْلُهَا
مُنِعْنَا بِهَا مِنْ جَيْئَةٍ وَّذُهُوْبِ

یعنی ہم دنیا کی طرف لائے گئے ہیں، اب اگر موت نہیں آئے گی اور سب لوگ زندہ رہیں گے تو پھر دنیا میں چلنا پھرنا دشوار ہو جائے گا۔

وَقَدْ فَارَقَ النَّاسُ الأَحِبَّةَ قَبْلَنَا
وَأَعْيَا دَوَاءُ الْمَوْتِ كُلَّ طَبِيْبِ

یعنی ہم سے پہلے بھی سارے لوگ اپنے محبوبوں سے جدا ہو گئے ہیں، کیونکہ موت کے علاج نے ڈاکٹروں کو عاجز بنا دیا ہے۔

تاہم موت کی اس اٹل حقیقت کے باوجود علماء اپنی موت کے بعد بھی اپنے علمی کارناموں اور دینی خدمات کی وجہ سے اور اپنی روحانی اولاد کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

أَخُو الْعِلْمِ حَيٌّ خَالِدٌ بَعْدَ مَوْتِهِ
وَأَوْصَالُهُ تَحْتَ التُّرَابِ رَمِيْمُ

یعنی صاحب علم آدمی اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، اگرچہ اس کے جسم کے جوڑ جوڑ مٹی کے نیچے ریزہ ریزہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ جو علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب تھے، جو علم و عمل کے میدان میں ایک روشن باب رقم کر کے رخصت ہو گئے اور "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ"۔ کی کوس رحلت پر داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہمیں داغ مفارقت دے گئے اور ان شاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ عاش سعيداً و مات حميداً و نذكره دهراً مديداً.

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ اور مولانا عرفان میمنؒ کے پسماندگان کو اس عظیم صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور ان کو صبر جمیل پر اجر جزیل عطا فرمائے اور حضرت کے لگائے ہوئے باغ کی حفاظت فرمائے اور مرحومین کی قبروں پر رحمتوں کی بارش برسا دے، آمین یا رب العالمین۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

استاذ محترم مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کی

چند یادیں.......چند باتیں

مولانا محمد سفیان بلند، فاضل جامعہ ہذا

کیا عجب حادثہ ہے؟ کیسا دلخراش سانحہ ہے؟ جس استاذ محترم کی زیارت دلوں کو جلا بخشتی، ان کی گفتگو روح کو تر وتازہ رکھتی، آج ہم ان کی برکات وانوارات سے محروم ہوگئے۔ میرے محبوب استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ بعد نماز عصر کراچی سے اسلام آباد جانے والی بھوجا ائیر لائن کے حادثہ میں شہادت کا رتبہ پاکر اس دار فانی سے دار باقی کو روانہ ہوگئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

حضرت استاذ محترمؒ سے مجھے آٹھ سالہ درس نظامی کے زمانے میں شرح ملا جامی ۱۹۹۹ء میں ہدایہ شریف ۲۰۰۰ء میں اور تفسیر بیضاوی شریف ۲۰۰۲ء میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ طالب علمی کے دور سے ہی آپؒ کی ذات سے جو فائدہ میسر آیا، وہ میرے لئے گرانقدر سرمایہ ہے، فراغت کے بعد بھی برابر آپؒ سے ہر ملاقات میں محبت ودعا اور استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ الحمد للہ! اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے بندہ کو یہ توفیق بخشی کہ دورانِ تعلیم تمام اساتذہ کے ملفوظات ونصائح کو پابندی سے قلم بند کرتا رہا۔ آپؒ سے مختلف موقعوں پر بہت قیمتی نصائح اور مفید مشورے بھی ملے، سردست اس مضمون میں زمانہ طالب علمی کے مرتب کردہ چند ملفوظات پیش خدمت ہیں، جن کی تازگی اور حسن آج بھی اسی طرح برقرار ہے، جیسا کہ آپؒ کی زندگی میں تھا۔

علمی واصلاحی ملفوظات:

۱......ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس ذات سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں مسلمان بنایا، بہترین مذہب یعنی فقہ حنفی کی نعمت سے نوازا اور بہترین مسلک یعنی مسلک اہل سنت والجماعت دیوبند سے منسلک فرمایا، الحمد للہ! اس کے عقائد واحکام، مسائل وفروعات واضح، روشن، مفید اور سب سے

زیادہ صحیح ہیں، بخلاف دوسرے مسالک کے کہ ان کے پاس چند مخصوص مسائل ہیں۔

۲......آج جو یاد کرلوگے وہ بعد میں کام آئے گا، بعد میں ذمہ داریاں اور مسائل کی کثرت کی وجہ سے کچھ یاد نہیں کرسکتے۔

۳......انگریزی تعلیم بری چیز نہیں، بلکہ انگریزی تہذیب بری چیز ہے، اگر کسی بزرگ نے جوش میں آکر کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب لاتی ہے، اس وجہ سے وہ منع کرتے ہیں۔

۴......جو بات استاذ سے سنی، وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے، اگرچہ جتنی شروحات اور کتب کا مطالعہ کرلیا جائے، کیونکہ اصل تو استاذ کی صحبت کا اثر ہے۔

۵......عربوں میں سات قبائل تھے، اہل حجاز، اہل یمن، ہوازن، ثقیف، عقیل، طئی، بنوتمیم اور قرآن کریم ان سات کی قرأت پر نازل ہوا ہے۔

۶......کسی بھی مسئلہ کی بنیاد مثال پر نہیں ہوتی، مثال کے غلط ہونے سے مسئلہ کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن استشہاد کے غلط ہوجانے سے مسئلہ کی بنیاد خراب ہوجاتی ہے، لہذا صحیح استشہاد کا ہونا لازمی شرط ہے۔

۷......اللہ تعالیٰ نے آپ سب کو اونچا مقام دیا ہے، جو آدمی دین کا کام کرے، اللہ تعالیٰ اس کو اونچا مقام دیتے ہیں، لیکن اگر ہم دین کو اس لئے پڑھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا پیشہ ہو، فراغت کے بعد امامت کریں، پڑھائیں اور کچھ نہ ملا تو ناظرہ پڑھا کر کمائیں تو سمجھ لو ہم دین اس وجہ سے نہیں پڑھ رہے۔

۸......استاذ کو طلبہ سے یہ کبھی نہ کہنا چاہئے کہ فلاں کتاب مشکل ہے، کیونکہ طلبہ کی نفسیات یہ ہے کہ اگر ان کو کہہ دیا جائے کہ فلاں کتاب مشکل ہے تو ان کی ہمت کم ہوجاتی ہے اور جن کی ہمت کم ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس فن اور کتاب کے پڑھنے والے لوگ اور طلبہ الگ ہیں۔ مشکل کچھ نہیں، ذرا سی ہمت کی بات ہے۔

۹......میں کہا کرتا ہوں کہ بنات کا درس نظامی کورس ۴ سال کی بجائے ۱۶ سال ہونا چاہئے، کیونکہ جب کاملین فی العقل طلبہ کا کورس ۸ سال کا ہے تو ناقصات فی العقل طالبات کے لئے دوگنا یعنی ۱۶ سال کا ہونا چاہئے، مگر یہاں تو بنات کو ۴ سال میں فارغ کردیتے ہیں۔

۱۰......ڈاکخانہ کا نظام حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں رائج ہوا، آپؓ نے مختلف راستوں پر ٹھہرنے کے لئے آرامگاہیں اور اسٹیشن بنوائے جن کو برید کہا جاتا تھا، برید، برد سے ہے بمعنی ٹھنڈا ہونا، یہاں آکر لوگ آرام کرتے تھے۔

۱۱......**ھجد** بمعنی نوم یعنی نیند اور **تھجد** بمعنی **ترک النوم** یعنی نیند کا ترک کرنا، راتوں کو نیند کا ترک کرنا اللہ کو بہت پسند ہے، رات کو آپ تہجد کا اہتمام کیا کرو۔

۱۲......حضرت امام مبردؒ کا تکیہ کلام تھا۔''**برد اللّٰہ من بردنی**'' یعنی جو مجھے ٹھنڈک پہنچائے اللہ اسے ٹھنڈک پہنچا، اس وجہ سے ان کا نام مبّرد پڑ گیا، لفظ مبرد کو بکسر الراء وبفتح الراء دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

۱۳......علم ٹھوس اور راسخ ہو تو دین کے جس شعبے میں جاؤ گے اللہ تعالیٰ کام لے گا اور اگر ٹھوس نہ ہوا تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

۱۴......فرقۂ معتزلہ کی ابتداء تابعین کے دور میں ہوئی، یہ فرقہ شریعت کی ہر بات کو عقل سے پرکھتا تھا، اس کے بانی واصل بن عطاء اور عمر بن عبید دو ساتھی تھے، جو حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد تھے، انہوں نے استاذ سے اختلاف کیا اور ان کو چھوڑ دیا تو اس پر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ''اعتزلا عنا'' یعنی یہ دونوں ہم سے الگ ہوگئے، اس کے بعد ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

۱۵......علم بلاغت کی اصطلاحات یاد کرنے کے لئے آسان اور مفید کتاب''دروس البلاغۃ'' ہے، اس کا مطالعہ مختصر المعانی پڑھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۱۶......آج ہم دین کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دین کو ہماری ضرورت نہیں، دین تو ساری زندگی کا نام ہے۔ لوگوں نے پردہ کو صرف عدت میں لازم سمجھ لیا ہے، جبکہ عورت کو پردہ ساری زندگی کرنا چاہئے۔

۱۷......اگر کوئی مرد دعویٰ کرے کہ سامنے سے آنے والی عورت کے متعلق میرے دل میں کچھ نہیں اور عورت بھی دعویٰ کرے تو یہ''**فیما بینھما وبین اللہ**'' تو ہوگا، مگر قانون اسلامی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آپس میں ملیں، بلکہ اس پر مؤاخذہ ہوگا، اپنی نگاہوں کو پست رکھیں، ویلڈنگ والے کو دیکھیں کہ کس طرح اپنے کام میں لگن دوسری طرف نہیں دیکھتا۔

۱۸...... ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں، ہم تو کسی کی دعا سے پار ہو جائیں گے، ہمارے لئے دعا کرو، دعا میں بخل نہ کرو، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ فرماتے تھے کہ:''او میاں بخیل! اگر تمہاری جیب سے ایک روپیہ چائے کے لئے نہیں نکلتا تو دعا ہی کر لیا کرو کہ اس میں تو پیسہ بھی نہیں لگتا''۔

۱۹......نماز سے قبل تحری لازمی ہے، یہ نہیں کہ بغیر تحری کے جہاں چاہا منہ کر کے نماز پڑھ لی، بلکہ تحری کرے، بعض لوگ بس یا اسٹیشن میں بغیر قبلہ معلوم کئے نماز پڑھ لیتے ہیں اور آیت''**فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ**'' پڑھتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

۲۰......تکبیر تحریمہ سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں نماز سے باہر حلال تھیں، اب وہ حرام

ہوگئیں، اب صرف اللہ کے حضور کھڑے ہیں، یہاں تو ایسا حال ہوتا ہے کہ نماز میں بھی دنیاوی خیالات آتے ہیں۔

۲۱...... ہر ایک کے سوال کا جواب نہ دیا جائے، کیونکہ اس کا فائدہ نہیں، بعض اوقات لوگ ایسے سوالات کرتے ہیں کہ ان کے جواب دیتے ہوئے شرم آتی ہے، کیونکہ ان کا اعتراض براہ راست قرآن وحدیث پر ہوتا ہے، اس کے جواب دینے سے ان کے ایمان کا خطرہ بھی رہتا ہے۔

۲۲...... آج کل لوگوں میں استخارے نکلوانے کی عادت ہے، دور دراز علاقے میں جاتے ہیں کہ فلاں سے استخارہ نکلوانا ہے، بعض علاقوں میں تو اس کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ آپ کے پاس استخارہ کی دعا موجود ہے، جس کو ضرورت ہو بتلائیں اور وہ خود استخارہ کرے، استخارہ میں خواب وغیرہ کا دیکھنا حدیث سے ثابت نہیں، البتہ بزرگوں نے بتلایا ہے، لیکن ہر ایک تعبیر کا ماہر نہیں، استخارہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلبی رجحان پر اشارہ ہوتا ہے۔

۲۳...... لوگوں کو سورۂ فاتحہ کے ذریعے شفا مل جانے پر اتنا یقین نہیں، جتنا عام وظائف کا یقین ہے، حالانکہ سورۂ فاتحہ میں موت کے سوا تمام بیماریوں سے شفا ہے، کسی کو بتلاؤ تو کہتا کہ کوئی اور وظیفہ بتلاؤ، ایسوں کو وظائف پورے کرنے کا شوق ہوتا ہے، نمازیں قضا کردیتے ہیں، ایک صاحب قرضوں میں جکڑے ہوئے تھے، میں نے ان کو حضور ﷺ کی دعا سکھائی: ''**اللّٰھم اکفنی بحلالک عن حرامک وأغننی بفضلک عمن سواک**'' تو مجھے بزبان حال یوں دیکھنے لگے کہ یہ تو کوئی وظیفہ نہیں، کوئی اور وظیفہ بتلاؤ، حضور ﷺ سے بڑا پیر اور بزرگ کون ہوسکتا ہے؟ (کوئی بھی نہیں)۔

۲۴...... اللہ کی ذات بڑی، اسی طرح اللہ کا نام بھی بڑا، اللہ تعالیٰ کے نام کو وسیلہ بنا کر دعا کرنا صحیح ہے، لیکن اس طرح نہ کہے کہ: اے اللہ! تو رحمٰن ہے، رحیم ہے، تو یوں کردے، بلکہ یوں کہے کہ: یا اللہ! تو رحمٰن ہے رحم فرما، کرم فرما۔

۲۵...... دنیا میں تحقیق ہورہی ہے کہ دنیا کی پہلی زبان کونسی ہے؟ جمہور کا قول عربی زبان کا ہے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے آئے تو وہاں سے عربی آئی، پھر حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد جس جزیرے پر اترے اس کا نام سریان بھی تھا تو وہاں سے سریانی زبان آئی، آپ اس کو تاریخ میں پڑھ لو، میں نے شیخ ڈاکٹر بشار عواد شامی حفظہ اللہ سے پوچھا کہ پہلی زبان کونسی تھی؟ فرمانے لگے کہ: ''جنت اور حضور ﷺ کی زبان عربی ہے، ہمارے لئے یہی دلیل کافی ہے''، شیخ صاحب حدیث وتاریخ دونوں میں نمایاں مقام اور مہارت رکھتے ہیں، میں نے پوچھا کہ عربوں کی تقسیم عاربہ، بائدہ اور مستعربہ صحیح ہے؟ کہنے لگے کہ جو عرب میں گیا وہ عربی بن گیا اور جو عجم میں گیا وہ عجمی بن گیا، اگر چہ کہیں بھی رہنے والا ہو ''**من استعرب صار عربیاً ومن استعجم صار عجمیاً**''۔

اسی طرح فرمانے لگے کہ: ''جو لفظ قرآن کریم نے استعمال کیا، وہ عربی ہے، اگرچہ پہلے سے عجمی لفظ ہو''، جمہور فرماتے ہیں کہ: قرآن مجید میں عربی الفاظ اور عجمی الفاظ دونوں ہیں اور آیت مبارکہ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ'''' للاکثر حکم الکل''کے تحت بیان کی گئی ہے۔

۲۶...... درجہ رابعہ کے سال میں نے ''تفسیر عثانی'' بیس روپے میں خریدی، اچھی تفسیر ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ تھا جس میں دوسری تفاسیر پر تبصرہ تھا، مثلاً مودودی صاحب کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے متعلق مذکور تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات رحمان ورحیم کے مبالغہ کی تشبیہ اردو کے لفظ لمبا تڑنگا سے دی ہے، یہ بے ادبی کا جملہ ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو ایسے جملوں سے تشبیہ دینا خطرناک غلطی ہے، میں نے کتب خانے میں جاکر ''تفہیم القرآن'' سے مراجعت کی تو یہ عبارت نہ تھی، میرے دل میں خیال آیا کہ کسی کی طرف اس طرح غلط نسبت نہیں کرنی چاہئے، پھر میں حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ کے پاس مجلس دعوت وتحقیق گیا تو انہوں نے ''تفہیم القرآن'' کا پرانا چھپا ہوا نسخہ نکالا، اس میں یہ عبارت مل گئی، تب معلوم چلا کہ یہ لوگ ہمارے اکابر کی عبارات کو دیکھ کر مودودی صاحب کی عبارات کو ٹھیک کررہے ہیں۔

۲۷...... یہ دعا یاد کرلو اور پڑھا کرو: **اللّٰهم فارجَ الهمّ كاشفَ الغمّ مجيبَ دعوة المضطر رحمنَ الدنيا والآخرة ورحيمَهما أنت ترحمني فارحمني رحمة تغنيني بها عمن سواك**''۔

۲۸...... انسان اللہ تعالیٰ کی جتنی عبادت کرلے، وہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرسکتا، مشہور واقعہ ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک گلاس پانی پینے کے لئے اپنی آدھی حکومت اور اس کو نکالنے کے لئے آدھی حکومت دے دی، کیونکہ پانی کا پینا اور اس کا پیشاب کی صورت میں نکل جانا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

۲۹...... انسانی بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر جوڑ کا صدقہ دینا چاہئے، ان جوڑوں کے درمیان لزوجت یعنی چکنائی کا مادہ ہے، اگر وہ ختم ہو جائے تو یہ کام کرنا چھوڑ دیں، دو رکعت نماز جوڑوں کا صدقہ ہے، لہذا آپ بھی اس صدقہ کی عادت بنائیں، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

۳۰...... شکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ زبان سے ادا کیا جائے، دوسرا طریقہ اعضاء وجوارح سے ادا کرنا ہے کہ کسی نے کوئی کام کیا تو مکافات عمل پر اس کا کام کردیا جائے، تیسرا طریقہ دل سے ادا کرنا ہے کہ اس کو اچھا سمجھا جائے، ایک شاعر کہتا ہے:

وما كان شُكرِي وافياً بِنَوَالِكُم
ولكني حاولتُ في الجهد مذهباً
أفادتكم النعماءُ مني ثلاثةً

یدی ولسانی والضمیر المحجبا

۳۱......ایک سادہ لوح شخص سے کس نے پوچھا کہ دینار کی قیمت زیادہ ہے، درہم کی قیمت اس سے کم ہے اور فلس کی قیمت اس سے کم، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کو کوئی جواب نہ آیا، مگر اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے لفظ دینار پانچ حرفی تو اس کی قیمت زیادہ، درہم چار حرفی تو اس کی قیمت اس سے کم اور فلس تین حرفی تو اس کی قیمت اس سے کم ہے، اس واقعہ کو لطائف میں شمار کیا ہے۔ حقیقت ایسی نہیں یا ہوسکتا ہے کہ لفظ کی وضع میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہو۔

۳۲......اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پیدا فرمائے گا جو گناہ کرے گی اور توبہ کرے گی، یہ حدیث گناہ پر ترغیب نہیں، بلکہ توبہ پر ترغیب کے لئے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

۳۳......قضائے حاجت کے بعد کی دعا میں ''غفرانک'' پڑھنے کی اچھی توجیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ذکر کی ہے کہ آدمی جب اپنی غلاظتوں کو دیکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غیر مرئی غلاظتوں حسد، کبر، کینہ اور عداوت کا استحضار کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میرے اندر سے ان غلاظتوں کو بھی دور فرما تو گویا ''غفرانک'' سے ان باطنی غلاظتوں پر توبہ واستغفار کرنا ہے۔

۳۴......اللہ رب العزت کی شان میں ایسا کوئی جملہ جس میں سوئے ادب کا احتمال ہو اور تاویل سے وہ احتمال دور بھی ہو جاتا ہو، بیان کرنا مناسب نہیں، اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے اور ہم اس جیسے جملوں سے احتراز کرتے ہیں۔

۳۵...... یہ انسان بھی کیسے گاڑی چلاتا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیرنگ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ کسی اور کے اختیار میں ہے، اس کے اختیار میں ہو تو سامنے والے کو کچل دے، اللہ تعالیٰ نے محافظ فرشتے مقرر کئے ہیں جو انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

۳۶...... لوگ حج وعمرہ کے موقع پر مقامات مقدسہ کی زیارات کو جاتے ہیں، غار حرا اور غار ثور پر جاکر تصویر کھنچواتے ہیں، میرا ایک مقتدی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں غار ثور گیا تو فوٹو بنانے والوں نے کہا کہ تصویر کھنچوالو! میں نے منع کیا، مگر انہوں نے زبردستی کی اور تصویر کھینچ لی، میں نے سوچا کہ چلو بچوں کو دکھادوں گا، میں واپس گروپ کے پاس آیا تو وہ تصویر وہاں گر گئی اور گروپ کے ساتھیوں نے دیکھ لی، امیر گروپ کو شکایت بھی کردی، میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو ایک گناہ کیا اور تم لوگوں نے کئی گناہ کئے، میرا گناہ ظاہر کیا، میری غیبت کی، میری چغل خوری کی، وغیرہ۔ امیر صاحب کہنے لگے کہ تم کسی عالم سے پوچھ لو، کہیں تم پر دم تو نہیں آگیا؟

میں نے مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب دامت برکاتہم سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نہیں! صرف توبہ استغفار کرلو، میں بھی آپ لوگوں کو یہی کہتا ہوں کہ دین کو اچھی طرح سیکھو، کہیں تصویر کھنچوانے پر دم نہ لگوادینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کا رتبہ بڑھانا چاہتے ہیں تو گناہ کرواکر توبہ کی توفیق دیتے ہیں کہ اس پر وہ مقام ملے گا جو نیکی پر نہیں ملتا، گناہ بھی کبھی کبھی رتبہ بڑھانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، آدمی کو چاہئے کہ اپنے گناہ پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔

۳۷...... انبیاء کرام علیہم السلام کے مراتب میں افضلیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اور خود حق سبحانہ وتقدس اور حضور ﷺ نے اس کو بیان کیا ہے، مگر امت کو تعلیم دی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام میں ایک دوسرے کو فضیلت نہ دیں، اس میں صرف اللہ ورسول ﷺ کو اختیار ہے، ہم تو حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال میں تاویل کرتے ہیں، لیکن بعض خطباء اس کو جب بیان کرتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا، یہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو افسانہ بنادیتے ہیں، آپ حضرات مستقبل کے خطباء ہیں، اس لئے آپ سے کہہ رہا ہوں، بات دل کو لگ رہی ہے یا نہیں؟

۳۸...... آپ کل فارغ ہوجائیں گے، آٹھ سال پڑھ کر جس چیز کا ذہن نہ بنا، وہ ایک دو مہینے کسی چیز میں لگ کر ذہن میں بیٹھ جائے گی، اس لئے ایک اہم نصیحت کرتا ہوں:

''ہم حنفی ہیں اور لاکھوں مسائل میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں، ہمارا تعلق مسلکِ دیوبند سے ہے، ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اب اگر آپ میں سے کسی کی کوئی رائے ہوتو وہ اپنی حد تک رکھے، اس کی تحقیق کرے، مگر اپنا مسلک نہ بنائے، بلکہ جمہور علماء دیوبند کے مسلک کو سامنے رکھے، اپنے اکابر اور جمہور علماء کو برا نہ کہے، ان کی طرف شر کی نسبت نہ کرے، اس میں اپنا ہی نقصان ہوگا، اپنی رائے وتحقیق کو اپنی حد تک رکھیں۔

۳۹...... میرے دوستو! یاد رکھو، ہدیہ یک طرفہ نہ ہو کہ یہ رشوت تو نہیں، البتہ اس میں رشوت کی بوضرور ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''تهادوا تحابوا'' ہدیہ دینے سے محبت بڑھتی ہے، ہدیہ مقاماتِ محبت میں سے ہے، ہدہد پرندے نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت کی تو اس پر یہ شعر کہا گیا ہے:

جاءت سليمان يوم العرض هدهدةٌ
أهدت بجراد كان في فيها
وأنشدت بلسان الحال قائلةً
ان الهدايا على مقدار مُهدِيهَا

ایک شاعر کا شعر ہے:

لو کان یھدیٰ الی الإنسان قیمتہ
لکان یھدی لک الدنیا ومافیھا

۴۰...... میں نے ایک بزرگ سے سنا کہ عنقریب وحدت ادیان کے نام ایک فتنہ آرہا ہے اور وہ کہیں گے کہ سارے ادیان سے مقصود اللہ تک پہنچنا ہے، چاہے چرچ سے ہو، معبد سے ہو، مندر سے ہو، مسجد سے ہو، واقعۃً یہ ایک فتنہ آرہا ہے، میں نے اپنے جامعہ کے ایک فاضل سے سنا اور وہ واقعی میں فاضل (یعنی فضلہ سے) تھا، ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگا کہ: اصول معلوم ہونے چاہئیں، قرآنی آیت ''إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارىٰ'' سے معلوم چلتا ہے کہ یہود ونصاریٰ بھی حق پر ہیں، اس کی وجہ سے ان کو ساتھ ذکر کیا ہے، یہ مولوی حضرات بلا وجہ ایک دوسرے پر فتویٰ لگاتے ہیں اور ہر ایک کو گمراہ کہتے ہیں۔ میں نے اس کو سمجھایا، مگر وہ اکابر پر اعتراض کرنے لگا، اپنے اکابر پر اعتماد کریں کہ ان پر اعتماد کرنے میں بچاؤ ہے، ورنہ آدمی گمراہ ہو جائے گا۔

۴۱...... حضرت تھانویؒ کے اکثر علوم موہبی ہیں، انہوں نے علم تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے اکابر دیوبند سے حاصل کیا، مگر صحبت اکابر نے ان کے علوم میں چار چاند لگا دیئے۔

۴۲...... ہم پر اس جامعہ اور بانی جامعہ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے احسانات ہیں، اگر آج ہم اس جامعہ میں نہ ہوتے، یہاں نہ پڑھا ہوتا، یہ دینی خدمت کا موقع نہ ملتا تو پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکر کھا رہے ہوتے؟ آپ سے کہتا ہوں کہ بانی جامعہ اور اساتذۂ جامعہ کو ایصال ثواب کرتے رہا کریں، ان کو دعاؤں میں یاد رکھیں، جامعہ کے لئے دعا کیا کریں، ہم پر جامعہ کے بہت احسانات ہیں، ہمیں یہاں ہر چیز مفت میں فراہم کی جاتی ہے، کسی چیز کا کوئی عوض نہیں لیا جاتا، صرف دعا تو ہم کر سکتے ہیں۔

۴۳...... تقویٰ کیا ہے؟ ہر کام سے پہلے یہ خیال ہو کہ لوگوں کے دیکھنے سے پہلے اللہ دیکھ رہا ہے اور ہر بات سے پہلے یہ سوچے کہ سب سے پہلے میرا اللہ سن رہا ہے اور آدمی دنیاوی خواہشات سے بچ کر اس دنیا سے گذر جائے۔

۴۴...... لوگوں کے بھی عجیب استدلال ہوتے ہیں، ایک صاحب کہنے لگے کہ: میں نے شیعہ عورت سے شادی کر لی ہے، میں سنی ہوں، میرے والدین بھی خوش ہیں، اس سے نہ میرے دین کا نقصان ہے نہ اس کے دین کا، ویسے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْن'' یہ ہے لوگوں کا غلط استدلال کہ اپنی طرف سے قرآن کو بیان کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ آیت ہے، حدیث نہیں۔

۴۵...... ایک استاذ سبق پڑھا رہے تھے تو کہنے لگے کہ: یہ نئی بات ہے اور ہر نئی بات ''کل

جدود لذوذ'' کے تحت بیان کی جاتی ہے، ایک شاگرد نے کہا کہ استاذ جی! یہ جملہ تو ''کل جدید لذیذ'' ہے، کہنے لگے کہ یہ جملہ بھی پرانا ہوگیا ہے، اس میں بھی جدت آنی چاہئے۔

۴۶......اہل علم کی ذمہ داری بہت بڑی ہے، اگر وہ ہر مجلس میں ہاں میں ہاں ملائیں تو ان کی پکڑ ہوسکتی ہے، اس سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ ہر مجلس میں جانے سے بچیں، ورنہ پکڑ ہوگی کہ فلاں مجلس میں یہ غلط بات ہوئی، تم نے صحیح بات کو کیوں نہ واضح کیا؟۔

۴۷......حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: علم عجیب خزانہ ہے، دوسرے خزانے خرچ کرنے سے ختم ہوتے ہیں اور یہ خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔

۴۸...... میں ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم مولویوں سے سوال فرمائے کہ: لوگوں نے اسلامی نظام لانے کے لئے بہت کچھ کہا اور کیا، لیکن تم لوگوں نے کیا کیا؟۔

۴۹......انکار حدیث ایک فتنہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ صرف قرآن سے دلیل بیان کرو، ایسے لوگوں کا ذکر حدیث میں آتا ہے کہ آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو یہ کہیں گے کہ ہم کو صرف قرآن سے دلیل دو، میں نے رسالہ'' طلوع اسلام'' کے ایک مضمون میں پڑھا کہ اس فتنہ کا اصل محرک اور بانی سرسید احمد خان تھا جو بظاہر مسلمان تھا اور اندر سے فتنہ پرور تھا۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کو آخری زمانے میں اس فتنہ کی بڑی فکر تھی کہ کیسے یہ ختم ہوگا؟ بار بار اس فتنہ کے انسداد کی بات کرتے تھے، آپ اگر احادیث کو چھوڑ دیں تو نماز کی رکعتوں کی تعداد، زکوٰۃ کے نصاب اور اس کی مقادیر، روزہ کی صحیح صورت اور ترتیب، حج کا مکمل طریقہ اور دیگر احکام قربانی، صدقات، جہاد اور بیوعات کی تمام صورتیں کہاں سے ملیں گی؟ پھر آپ آیت کریمہ ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِم'' کی تفسیر کیا کریں گے؟ ان تمام چیزوں کا ہمیں حضور ﷺ کے ارشادات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسا عمل کس طرح کرنا ہے اور حضور ﷺ سے محبت کی علامت آپ ﷺ کی اطاعت ہے، اطاعت میں ہر طریقہ محبوب کا لینا ضروری ہے، ورنہ اطاعت ناقص رہے گی، بلکہ اطاعت ہی نہ ہوگی۔

۵۰......تقدیر میں انسانی عقل کو روکا گیا ہے کہ آگے نہ بڑھے، جہاں تک جانے کو کہا ہے وہاں تک جائے۔ انسانی عقول میں فرق ہے، اسی اعتبار سے مؤاخذہ میں بھی فرق ہوگا، اسی وجہ سے مجنون سے مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ اس میں عقل نہیں، اپنی عقلوں کو لگام دیں، حد سے آگے نہ بڑھنے دیں، گذشتہ امتوں کی ہلاکت مسئلۂ تقدیر میں غور وفکر کی زیادتی پر ہوئی۔

۵۱......موت کا وقت مقرر ہے، جب اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے آئے گی، ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ اس وجہ سے واقع ہوئی ہے، لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں، اگر یہ ہوتا تو یوں ہوجاتا، آدمی بچ جاتا، لوگوں کا جملہ الٹا ہوگیا ہے کہ یوں ہوگیا تو وہ مرگیا، حالانکہ صحیح جملہ یہ ہے کہ موت آنی تھی، یہ چیز سبب بن گئی۔

۵۲ ...... انسان میں کمال ہوتا ہے، مگر روحانی امراض مثلاً جہل، بدعقیدگی، حسد، لوگوں کے لئے کینہ، برائی سے محبت وغیرہ اس کمال کے لئے مخل بن جاتے ہیں اور انسان فضائل کے حصول سے رہ جاتا ہے، انسانی کمال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں چلا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کو انبیاء علیہ السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کا درجہ اور ساتھ مل جائے۔

۵۳ ...... جھوٹ بولنا حرام ہے، سوائے تین جگہوں کے کہ وہاں پر جائز ہے، ایک یہ کہ دو آدمیوں میں صلح کرادی جائے۔ دوسرا جنگ کے دوران، مثلاً آدمی ایسی بات کہے کہ دشمن پر قابو پالے، اس کو ''الحرب خدعة'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تیسرے میاں بیوی میں اَن بَن ہو جائے تو صلح کرادی جائے۔ زوجین میں علیحدگی بچوں کے قتل کے مترادف ہے، اس سے اولاد نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے، اس موقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ توریہ کرلیا جائے۔

۵۴ ...... یہ جملہ یاد رکھیں کہ ''اسلام دین فطرت ہے'' اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اسکی عقل کی کمی ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ ''وَمَآ أُوْتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلاً'' آج دنیا کی نگاہ میں عقل مند کوئی اور ہوتا ہے، جبکہ قرآن وحدیث میں عقل مند کسی اور کو کہا گیا ہے۔

۵۵ ...... فرقۂ قدریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کاسب کے ساتھ ساتھ خالق بھی ہے، انسان کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ آج بھی یہ لوگ موجود ہیں، آؤ! میرے ساتھ آؤ! میں دکھاؤں، کبھی فرماتے کہ یہ جو باہر پتلون والے پھر رہے ہیں، ان میں ایسے لوگ دکھاتا ہوں۔

۵۶ ...... شریعت مطہرہ ظاہری بات دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے، کس کے دل میں کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آخرت میں ہوگا، تصدیق قلبی کا علم تو اللہ کو ہے، یہاں تو تصدیق لسانی اور اقرار پر مفتی فتویٰ دے گا:

إن الكلام لفي الفؤاد وإنما
جعل اللسان على الفؤاد دليلاً

۵۷ ...... جب ہوائیں چلتی ہیں تو اس وقت ہوا کو گالی دینے کے بجائے یہ دعا پڑھو: ''**اللّٰهم إني أسئلك خيرَ هذه الريح وخيرَما فيها وخيرَما أمرت وأعوذبك من شر هذه الريح وشرما فيها وشرما أمرت**''۔

۵۸ ...... حضور ﷺ کی شان تو ویسے ہی بہت بلند ہے، لیکن دنیا میں آپ کی زندگی کا ایسا واقعہ جس سے آپ ﷺ کی رفعت شان بیان کی جائے، وہ واقعۂ معراج واسراء ہے اور اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لئے اعلیٰ صفت عبد کو ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے: ''سُبْحَانَ الَّذِىٓ أَسْرىٰ بِعَبْدِهٖ لَيْلاً'' اور ارشاد فرمایا: ''فَأَوْحىٰٓ إِلىٰ عَبْدِهٖ مَآ أَوْحىٰ'' آپ بتائیں کہ بندگی سے

بڑھ کر اور کیا شان ہوسکتی ہے اصل راز ہی عبدیت اور بندگی میں ہے۔

اسراء اور معراج کی تعریف میں فرق ہے، حضور ﷺ کا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر رات کو ہوا، یہ اسراء کہلاتا ہے، اس کا ذکر سورۃ الاسراء یعنی سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی سیر، انبیاء علیہم السلام سے ملاقات، جنت وجہنم کے مختلف مقامات کو دیکھنا اور رب تعالیٰ کا دیدار وغیرہ یہ سب سفر معراج ہے، اس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے، اکثر مولویوں کو بھی ان میں فرق پتہ نہیں ہوتا۔

۵۹ ...... حدیث شریف میں آتا ہے ''**بئس العبد عبد یختل الدین بالشبهات**'' معنی یہ ہے کہ دین کو شبہات اور غلط تاویلات کے ساتھ بیان کرنے والا بدترین بندہ ہے، ایسا آدمی جو حلال کو حرام، حرام کو حلال، جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کرنے والا ہو، وہ بدترین بندہ ہے۔

۶۰ ...... بخاری شریف کی ایک موقوف روایت میں ہے کہ ایمان چابی ہے اور اعمال اس چابی کے دندانے ہیں، بیضاوی شریف میں ص: ۴۸ پر ہے کہ ''**الإیمان الذی هو عبارة عن التحقیق والتصدیق أسّس أی أساس والعمل الصالح کالبناء علیه**'' مفہوم یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، جس کی مثال بنیاد کی سی ہے اور اعمال صالحہ اس بنیاد پر عمارت کی مانند ہے۔

۶۱ ...... ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے بندوں سے محبت کرتا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جو رات کو اٹھ کر اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھتا ہے اور اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔

۶۲ ...... دنیا والے کہتے ہیں کہ مسلمان متعصب ہیں، ایک عرب شیخ نے بہت اچھا اس کا جواب دیا، کہتے ہیں کہ: تم کہتے ہو کہ: ہم متعصب ہیں؟ جبکہ تم بتاؤ کہ تم میں سے کسی کا نام محمد ہو یا کسی نے اپنا یا اپنے بچوں کا نام محمد رکھا ہو، بچیوں کا نام عائشہ وفاطمہ رکھا ہو، جبکہ ہم مسلمان اپنی اولاد کا نام تمہارے انبیاء علیہم السلام خاص کر حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام پر رکھتے ہیں، ہم میں تو اس نام کے لوگ بہت ہیں، تم میں کوئی ہے؟ جس کا نام ہمارے آقا اور پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے نام پر ہو، بتاؤ! متعصب کون ہے؟

۶۳ ...... یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ سمجھنا، اس کو پڑھنا اور اس کو بیان کرنا، جب انسان اس کو سمجھتا ہے تو اس کو مزا آجاتا ہے، آج اسی وجہ سے اس قرآن کریم سے دور کیا جارہا ہے۔

۶۴ ...... مدرسہ میں رہتے ہوئے ہمارے کچھ پہلوؤں میں کمی ہے، یہ باتیں ہم لوگوں سے نہیں کہہ سکتے، لیکن ہم سوچیں کہ ہم جس کام میں لگے ہیں، اس میں خیر زیادہ ہے یا شر؟ اگر خیر زیادہ ہے تو اس کو مقدم رکھیں، کیونکہ ترک خیر بھی شر کا ذریعہ بنے گا، بیضاوی شریف میں ص: ۵۹ پر عبارت

ہے کہ: ''فان ترک الخیر الکثیر لاجل الشر القلیل کثیر''۔

۶۵ ...... انسان کو تین طرح کی قوت دی گئیں ہیں: (۱) قوت شہویہ (۲) قوت غضبیہ (۳) قوت عقلیہ۔ پہلی دو قوتیں انسان کو ہلاتی ہیں اور تیسری قوت انسان کو باندھ کر رکھتی ہے اور اس قوت کو دین کے تابع رکھا گیا ہے، فرشتوں میں انسان کی پہلی دو قوتیں نہیں ہیں، البتہ ان میں عقل موجود ہے، فرشتوں نے انسانوں کی قوتوں کو الگ الگ دیکھا تو اعتراض کیا کہ اگر انسان حقدار خلافت ہے تو ہم تو اس سے زیادہ مستحق ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت عقلیہ عطا فرمائی کہ اس کی نگرانی میں بقیہ دو صفات اور قوات اچھی ہو کر خلافت کا کام اعلیٰ انداز میں انجام دے سکتیں ہیں۔

۶۶ ...... حضور ﷺ کے اخلاق کے بارے میں آتا ہے کہ ''کان خلقه القرآن'' اب جو حضور ﷺ کی مسند پر بیٹھے گا تو ان اخلاق کے ساتھ ہو، ورنہ کیسے وارث ہوگا؟ اور کیسے اس مسند پر بیٹھے گا؟

۶۷ ...... رفیق بناؤ، فریق نہ بناؤ، رفیق اور فریق کے حروف برابر ہیں، ترتیب بدلنے سے رفیق فریق اور فریق رفیق بن جاتا ہے، جو رفیق سے فریق بن جائے، اس کی توجہ اپنے کام سے ہٹ جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے کام میں لگتا ہے اور دوسرے کے کام کے خلاف سوچتا ہے، ہر ایک کو اپنا رفیق سمجھو، تاکہ اپنے کام سے توجہ نہ ہٹے۔

۶۸ ...... تعلیم کے آداب میں سے یہ ہے کہ استاذ کے پڑھانے کے لئے جاتے اور آتے وقت راستہ میں سوال نہ کرو، اب تو یہ ادب ختم ہوگیا ہے، بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ استاذ کو پرچیاں لکھتے ہیں اور نہ جانے پرچیوں میں کیا کیا لکھ دیتے ہیں، یاد رکھو! تمہاری کسی ایک بے ادبی والی پرچی سے علم کے سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔

۶۹ ...... امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے تین باپ ہوتے ہیں: (۱) ''من ولد'' یعنی جس نے جنا (۲) ''من زوج'' یعنی جس نے شادی کروائی یعنی سسر (۳) ''من علم'' جس نے علم سکھایا، یہ بات حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ بھی بیان کرتے تھے۔

۷۰ ...... حشویہ اور باطنیہ یہ دو فرقے ہیں جو عصمت انبیاء علیہم السلام کے قائل نہیں، انہوں نے حضرت آدم علیہم السلام کے قصہ سے استدلال کیا ہے۔ اہل حق اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے نہ صغائر ہوتے ہیں اور نہ کبائر، بلکہ انہوں نے ایک خلاف اولیٰ کام کو اجتہادی طور پر کیا ہے اور آپ کو پتہ ہے: مجتہد کا غلط اجتہاد بھی باعث اجر ہے، لیکن ان کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلاف اولیٰ کام پر سرزنش میں سختی ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور محبوب کو اختیار ہے کہ اپنے محبوب کو جس طرح یاد کرے، دنیا کا قانون اور فطرت کا

تقاضہ یہ ہے کہ اپنوں سے بوقت سرزنش سخت انداز میں کلام کیا جاتا ہے۔

۷۱..... انسان تکبر کرتا ہے، اگر وہ اپنا محاسبہ کرے اور اپنی حقیقت پر غور کرے تو تکبر نہ رہے، لوگ اپنے والدین کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں، ان کی نافرمانی کرتے ہیں، منہ پر تھپڑ مارتے ہیں، جبکہ ان کے کتنے احسان ہیں، اس پر غور کریں، ایک لڑکے کا باپ میرے پاس آ کر روتا تھا، مجھے معلوم تھا کہ اس کا لڑکا اپنے باپ کو ستاتا ہے، جب باپ کا انتقال ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا، نہ جنازہ پڑھایا، نہ پڑھا، بلکہ روتا رہا، مجھے تعجب سے ہنسی آ رہی تھی کہ اب رو رہا ہے، جب باپ زندہ تھا تو اس وقت کیا کیا؟۔

۷۲..... لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں، ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ نماز میں ''تَبَّتْ يَدَا أَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ'' پڑھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو بددعا ہے اور بددعا تو نہیں کرنی چاہئے، یہ لوگوں کی باتیں بھی بڑی عجیب ہیں۔

۷۳..... حدیث کے لفظ ''قرنی'' میں ایک لطیفہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے خلافت راشدہ کی طرف اشارہ ملتا ہے، چاروں خلفاءِ راشدینؓ کے اسماء گرامی کے آخر کا حرف اس میں ہے، تو ''ق'' سے ابوبکر صدیقؓ، ''ر'' سے عمرؓ، ''ن'' سے عثمانؓ اور ''ی'' سے علیؓ کی طرف اشارہ ملتا ہے، گویا معلوم چلا کہ حضور ﷺ کا زمانہ اس طرح ختم ہوگا، دوسرا آیت کریمہ: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' میں بھی ترتیب خلافت کی طرف اشارہ ہے کہ: ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' میں معیت کی اعلیٰ صفت حضرت ابوبکرؓ میں، ''أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' کی اعلیٰ صفت حضرت عمرؓ میں، ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' کی اعلیٰ صفت حضرت عثمانؓ میں اور ''تَرٰهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً'' کی اعلیٰ صفت حضرت علیؓ میں ہے۔

۷۴..... ''الصلوٰة عماد الدين'' اور ''الصلوٰة نور المؤمن'' حدیث میں مذکورہ ہے، البتہ ''الصلوة معراج المؤمنين'' حدیث نہیں، بزرگوں کا مقولہ ہے، مطلب اور معنی کے اعتبار سے صحیح ہے کہ نماز میں بندہ اپنے رب سے مناجات کررہا ہوتا ہے۔

۷۵.....

دوزخ اگر وسیع ہے تو رحمت وسیع تر
''لاتقنطوا'' جواب ہے ''هل من مزيد'' کا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس امید کرتے رہیں اور گناہ کرتے رہیں، بلکہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، امید بھی ہو، خوف بھی ہو، شعر سے مقصود یہ ہے کہ مایوس نہ ہو، رحمت کا امیدوار رہو۔

۷۶..... ہر مسلمان کے دل میں اللہ کا نام ہونا چاہئے، حضور ﷺ نے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاددہانی کی طرف متوجہ کیا، کھانے پر بیٹھے تو ارشاد ہے کہ: ''سم الله كل بيمينك وكل مما

یلیک''، بیت الخلاء میں جا رہے ہوں تو ارشاد ہے کہ: ''**اللّٰھم إنی أعوذبک من الخبث والخبائث**'' اور باہر نکل رہے ہو تو ارشاد ہے کہ: ''**غفرانک الحمد للہ الخ**''، رات کو سوتے وقت کی دعائیں اور احکامات ہیں، ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی ترغیب ہے، کتنا جامع دین ہے جو ہر موقع کی بات بتلاتا ہے اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے اس کی حفاظت میں لے آتا ہے، یہ دعائیں حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، عام لوگ ماشاء اللہ! بہت اہتمام کرلیتے ہیں جو تبلیغ میں کچھ وقت لگا لیتے ہیں، ہم کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے، ہمارے دین نے یہ ہمیں تربیت دی ہے۔

۷۷......تبلیغی جماعت والے اچھے لوگ ہیں، ماشاء اللہ! لوگوں کی خوب فکر کرتے ہیں، اس راستے میں بھی لوگوں کو شہادت کا رتبہ ملتا ہے، جی ہاں! ہمارے جامعہ میں ایک بہت ذہین لڑکا پڑھتا تھا، مولوی محمد سعید مرحوم نام تھا، اسکی عبارت بھی اچھی تھی، ایک دفعہ میں نے پشتو شعر پڑھا تو اس نے زبانی سنا دیا، وہ فراغت کے بعد تبلیغ میں سال لگانے گیا تو نہر میں گر کر شہید ہوگیا، **رحمه الله رحمةً واسعةً**۔

۷۸......اپنے اساتذہ کی قدر کرلیں، یہ چلے جائیں گے تو پھر آپ افسوس کرتے رہیں گے، بڑے بڑے اساتذہ چلے گئے، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ۔ جو آج موجود ہیں، ان کی قدر کرلیں، ورنہ کل یہ بھی نہ ملیں گے، ہم تو آج تک ان کی باتوں کو یاد کرکے روتے ہیں۔

اکابر جامعہ کے ملفوظات (بروایت حضرت الاستاذ مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ)

استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کو جامعہ اور اکابر جامعہ سے بہت محبت تھی، آپ نے اپنے اساتذہ اور اکابر جامعہ کے علوم کو اپنی ذات میں خوب جذب کیا، ان کے ملفوظات وفرمودات آپ کو ہر موقع کے یاد تھے، اکابر کی بات کو اپنے لئے بھی راہنما سمجھتے اور اپنے طلبہ کو بھی اس کی طرف متوجہ کرتے، خاص کر جب اکابر کی باتیں ان کے مخصوص انداز میں دہراتے تو وجد میں آجاتے، لہجہ بھی ان کے جیسا بنا لیتے، محبوبیت ومرجعیت کے پیکر بن کر ساری زندگی جامعہ اور اکابر جامعہ کے لئے گزری، اپنی جان، صلاحتیں اور زندگی کا ہر لمحہ دین متین کی سربلندی کے لئے صرف کرتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کی، زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی شہادت جیسے رتبہ والی، بہت کم یہ دولت کسی کو نصیب ہوتی ہے، اس مضمون میں آپ کے وہ ملفوظات ذکر کئے جارہے ہیں جو آپ نے اکابر جامعہ کے مختلف موقعوں پر درسگاہ میں بیان کئے، جنہیں بندہ طالب علمی کے زمانے سے نوٹ کرتا رہا، الحمد للہ! رب تعالیٰ کی توفیق سے پورے درس نظامی میں تمام اساتذہ کرام کے ملفوظات ونصائح کا اچھا خاصا مجموعہ جمع ہوگیا، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کو امت تک صحیح طور پر پہنچانے کی سعادت نصیب فرمائے، آمین۔

۱...... میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں افتتاحی تقریب کے موقع پر خود حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جو طلبہ نئے پڑھنے والے آئے ہیں، وہ تصحیح نیت کرلیں اور جو طلبہ پرانے والے ہیں وہ تجدید نیت کرلیں۔

۲...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ طلبہ کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ''ثم خیرا'' (وہاں بہتر ہے) کی ہے، ایک مدرسہ میں گئے، وہاں پڑھا، دوسرے مدرسہ کے بارے میں سنا کہ وہ اچھا ہے تو وہاں چلے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ مدرسہ ہمارے مدرسہ سے اچھا ہے۔

۳...... ہمارے ایک استاذ فرماتے تھے کہ: قرآن مجید سب سے زیادہ مظلوم کتاب ہے، ہر ایک اپنی بات کو جس طرح چاہے قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگرچہ اس کو قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کے آداب معلوم نہ ہوں، یہ قرآن کریم کے ساتھ ظلم ہے۔

۴...... حضرت مولانا شاہ محمد ابرار الحقؒ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ دین کے ہر کام میں اخلاص رکھو اور جو بھی دین کا کام کر رہا ہو، اس کی مدد کرو، آپس میں رفیق بنو، فریق نہ بنو، ان دونوں لفظوں میں ترتیب بدل گئی تو معنی بدل جائے گا۔

۵...... حدیث میں جائیدادیں بنانے کی ممانعت آئی ہے، ارشاد ہے ''لاتتخذوا الضیعة'' حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے تھے کہ جائیدادیں مت بناؤ۔

۶...... حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: دیکھو! سبق سمجھ لو، میں نے کھول کھول کر سمجھا دیا ہے، اگر اب نہیں سمجھو گے تو میں کہوں گا کہ قصور تو بیل کا ہے۔ بیل کا واقعہ یہ ہے کہ ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا تھا، بیل ٹھیک نہیں چل رہا تھا تو کسان کہنے لگا، دیکھو! اگر صحیح نہیں چلو گے تو کھیتی خراب ہو جائے گی تو میں مالک سے کہوں گا کہ قصور تو بیل کا ہے۔

۷...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دعا کیجئے، میں ان سے کہتا ہوں کہ تم صالحین بن جاؤ، تمام نمازی تمہارے لئے ہر نماز میں دعا کریں گے۔

۸...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ جو چیز بھی تبرکات نبوی اور تبرکات اکابر میں سے ہے، وہ ہمارے لئے نہایت نہایت قابل قدر ہے اور حضور ﷺ کا جسد اطہر زمین کے جس حصہ سے لگا ہے، وہ حصہ عرش سے زیادہ افضل ہے۔ پھر حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے کہ: اس نام پر لوگوں نے اپنے نام سے بہت چیزیں جمع کی ہیں اور وہ ویسے ہی دکھاتے ہیں، حالانکہ بعض جگہوں پر ایسی چیزیں ہیں، ہر جگہ نہیں، بہرحال! اب میں ایسی چیز بتا رہا ہوں جس کے تبرک نبوی ہونے میں پوری امت کا اختلاف نہیں اور وہ قرآن ہے، قرآن!۔

۹...... حضرت مولانا مفتی عبد السمیع شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ: کتاب شروع کرتے وقت

مصنف کے حالات، کتاب کے متعلق چند باتیں طلبہ کو بتانی چاہئیں، لیکن طلبہ بھی ایسے ہیں کہ ان کو بتاؤ یا نہ بتاؤ، یہ معاف نہیں کرتے، البتہ نہ بتانے میں تو خاص کر معاف نہیں کرتے۔

۱۰...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ: استاذ سبق سمجھے اور طلبہ دھیان سے سنیں اور اس سے زیادہ یوں فرماتے کہ: استاذ سمجھے، طلبہ نہ سمجھیں، یعنی استاذ کو اپنے فن اور کتاب سے بھرپور مناسبت ضروری ہو۔

۱۱...... حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ درود شریف پڑھنے کی بہت ہی تاکید فرماتے، کہتے کہ اس کا ثواب نقد ملتا ہے، سب کو ایک وقت مقرر کرکے درود شریف پڑھنا چاہئے، اس کا بہت فائدہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ ہمارے خاندان کو جو کچھ ملا ہے، وہ سب درود شریف کی برکت سے ہے۔

۱۲...... حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کے اعجاز کبھی ختم نہ ہوں گے، سورۃ المجادلہ ایسی سورت ہے جس کی ہر آیت میں لفظ اللہ موجود ہے۔

۱۳...... حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ: لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مختلف فرقے ختم ہوگئے، میں کہتا ہوں کہ یہ آج بھی موجود ہیں، پھر اپنے مخصوص انداز میں فرماتے کہ ہے کوئی!؟ میرے ساتھ چلے، میں اس کو دکھاتا ہوں، ایک دفعہ فرمانے لگے کہ: ان پتلونوں والوں میں یہ فرقوں والے ہیں۔

۱۴...... حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مسجد سے نکل رہا تھا تو دیکھا کہ ایک آدمی مانگ رہا ہے، ایک آدمی نے اس کو ایک روپیہ دیا، میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ سیٹھ تھا، مگر ایک روپیہ دیا، میں نے دس روپے دیئے، دس روپے دیئے، یہ آپ اپنے مخصوص انداز میں فرماتے۔

۱۵...... حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ حدیث ''أن تلد الأمة ربتها'' کا مفہوم یوں بھی سمجھ میں آیا کہ جب بے نظیر بھٹو پہلی بار وزیراعظم بنیں تو ان کی والدہ نصرت بھٹو کو سینئر وزیر کہا گیا، جن کا رتبہ تو نہیں ہوتا مگر نام ہوتا ہے۔

۱۶...... حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کے جسم کے عناصر اربعہ، یعنی آگ، ہوا، پانی اور مٹی کی تو فکر کی، مگر روح کے عناصر اربعہ یعنی علم، عمل، اخلاص اور خوفِ آخرت کی فکر نہ کی، اس کو انہوں نے حدیث ''**هذا الناس كلهم هالكون إلا العالمون**'' سے لیا ہے۔

۱۷...... حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے ملفوظات میں ہے کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا گیارہ مرتبہ پڑھا کرو: ''**اللّٰهم إنا نستعينك على طاعتك**''، انہوں نے حوالہ دیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اسکو پڑھا کرتے تھے، اہل علم کو چاہئے کہ وہ اسکا اہتمام کریں، کیونکہ ان کو امور دینیہ میں لگنا ہوتا ہے۔

۱۸...... حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے ایک صاحب مطالعہ کے لئے کتاب لے گئے،

واپس لائے تو اس کے صفحات نکلے ہوئے تھے، بسا اوقات کتابوں کے صفحات نکل جاتے ہیں، حضرتؒ کی عادت سلیقہ سے رکھنے کی تھی تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ تم کو ہدیہ ہے، ہم دوسری کتاب لے لیں گے۔

۱۹......حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر رہے ہیں، ان کے دورِ صدارت میں صدر پاکستان چیف آف آرمی اسٹاف جناب محمد ضیاء الحق مرحوم نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ وفاق کے درس نظامی کی سند ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کی سند کے مساوی ہوگی، حضرت مولاناؒ دورۂ حدیث میں سبق پڑھانے تشریف لائے، آپ دوران درس غیر ضروری باتیں یا سیاسی باتیں نہیں کرتے تھے، کسی طالب علم نے حکومت کے اس حکم نامہ کے متعلق سوال کیا تو اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ: اچھا تجھے معلوم ہوگیا ہے، اچھا اچھا! پھر فرمایا کہ یہ وفاق کی سند کو بڑھانے کا نہیں، بلکہ گھٹانے کا منصوبہ ہے، وفاق کی سند تو ایم اے سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ حکومت کی طرف سے آپ کے نام خط آیا کہ آپ کے وفاق المدارس کے تحت جو مدارس چل رہے ہیں، ان کا خرچہ کہاں سے آتا ہے؟ آپ نے ناظم وفاق سے فرمایا کہ ان کو جواب میں لکھ دو ''وَفِیْ السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ'' فقط والسلام۔

۲۰......حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ ہندوستان میں غیر مقلدین کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ احناف کی مساجد میں دو دو، تین تین کی ٹولیوں کی صورت میں جاتے اور ساتھ کھڑے ہوتے، امام جب سورۂ فاتحہ ختم کرتا اور ''وَ لاَالضَّآلین'' پڑھتا تو یہ لوگ زور سے آمین پڑھتے، یعنی آمین بالجہر پڑھتے، تاکہ لوگ سنیں اور ان سے وجہ پوچھیں تو وہ اپنے مسلک کو بیان کریں، اس طرح کرنے سے مختلف علاقوں کی مساجد میں انہوں نے جھگڑے پیدا کئے تو اہل علاقہ نے عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کردیا، انہوں نے فیصلہ کروانا چاہا، اس زمانے کا جج انگریز تھا، اس نے دونوں طرف کے لوگوں سے کتابیں منگوائیں اور مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ میں نے مسلمانوں کی کتابیں پڑھیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضور ﷺ سے دونوں طریقے ثابت ہیں، یعنی آمین بالسر بھی اور آمین بالجہر بھی، لیکن یہ لوگ یعنی غیر مقلدین جو آمین پڑھتے ہیں، وہ آمین بالشر ہے، لہذا آج سے ان کو اس کی اجازت نہیں کہ ان حنفی حضرات کی مساجد میں جاکر اس طرح آمین کہیں۔ ایک جج بھی قرآن وحدیث کے مطالعہ سے حق تک پہنچ سکتا ہے، مگر یہ غیر مقلدین اگر نیت درست نہ رکھیں تو ان کو حق نہیں مل سکتا، کیونکہ نیت میں شر وفساد ہے۔

۲۱......حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ ایک دیہاتی آدمی تھا، قرآن پڑھنا نہ جانتا تھا، مگر قرآن کریم پڑھنے کا شوق تھا، ہر سطر پر انگلی رکھتا اور کہتا کہ اے اللہ! یہ تیرا کلام ہے، یہ حق ہے، یہ بھی حق ہے، اس کو قرآن کریم کے حق ہونے پر یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔

۲۲...... حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ ایک بخیل کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ: اس کے پاس ایک انجیر آئی، اس نے دیکھا کہ سامنے سے قاری صاحب آرہے ہیں تو اس کو رومال کے نیچے چھپا لیا، کافی دیر قاری صاحب سے باتیں کرتا رہا، پھر قاری صاحب سے تلاوت سنانے کو کہا، اس نے سورۂ تین کی تلاوت یوں شروع کی ''الزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِنِیْنَ الخ''، بخیل نے کہا کہ ''این التین''؟ یعنی شروع میں لفظ ''وَالتِّیْنِ'' کہاں ہے، کیوں نہ پڑھا؟ قاری صاحب نے جواب دیا کہ: ''تحت مندیلک''، یعنی تیرے رومال کے نیچے ہے، حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: یہ واقعہ کتاب البخلاء میں ہے، یہ اچھی کتاب ہے، تم لوگوں کے پاس ہے؟ میرے پاس یہ کتاب تھی جو ایک بخیل لے گیا اور پھر لے کر نہیں آیا۔

۲۳...... ٹائی کا فلسفہ یہی ہے کہ نعوذ باللہ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھا دیئے گئے ہیں، میں نے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کو آخر زمانے میں دیکھا کہ تین باتوں پر زیادہ زور دیا کرتے تھے، ایک عورتوں کے لئے سختی سے پردہ کرنے پر، دوسرا ڈاڑھی رکھنے پر اور تیسرا ٹائی نہ لگانے کی ترغیب دیتے تھے، ڈاڑھی کے سلسلے میں تو آپ آخیر زمانے میں بغیر ڈاڑھی والے سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے، ہم علماء ہیں، ہمیں بھی اس سلسلے میں سنجیدہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۴...... حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ جلالین کے دوران اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو دو راستے دکھائے ہیں: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ، إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوْراً''. آپ یہ تین آیات بہت پڑھتے تھے، اسی وجہ سے میری بھی ان آیات کو پڑھنے کی بہت عادت ہے۔

۲۵...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: فجر کی سنتوں میں پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھنا سنت ہے، اس کا فلسفہ اور حکمت یہ ہے کہ پہلی سورت میں تخلیہ اور دوسری سورت میں تحلیہ ہے۔

۲۶...... حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس میں شیطان نے ان کو آیۃ الکرسی بتلائی اور حضور ﷺ نے جب یہ سنا تو ارشاد فرمایا کہ ''صدقک وھو کذوب''، یعنی جھوٹے آدمی نے سچی بات کہی، اس حدیث کی روشنی میں حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ایک مسئلہ مستنبط کرتا ہوں کہ: اگر کوئی مبتدع پیر اچھا وظیفہ بتادے تو وہ لینا جائز ہے۔

۲۷...... حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ: لوگ آپ پر جو کچھ خرچ کررہے ہیں، اس کی وجہ آپ کا دینی علم کو سیکھنا اور پڑھنا ہے، یہ ساری سہولتیں اس دین کی برکت سے مل رہی

ہیں، جو یہاں ٹھیکہ بنائے ہوئے رہ رہے ہیں اور کام ومقصد دوسرا ہے تو (جلال میں آتے ہوئے فرمایا کہ) میرا فتویٰ ہے، میرا فتویٰ ہے کہ یہ حرام ہے، یہ حرام ہے، آج آپ جو اساتذہ کی باتیں سن کر اس پر تبصرہ کرتے ہیں اور استاذ کی نصیحت کو مذاق سمجھتے ہیں، وہ طلبہ ذلیل ہوتے ہیں۔

۲۸......حضرت مولانا مفتی زین العابدینؒ جو تبلیغی جماعت کے اکابرین میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ جس طرح جسم کے نظام کے ٹھیک ہونے کے لئے قلب انسانی کا ٹھیک ہونا ضروری ہے، حدیث میں آتا ہے:**إن في الجسم لمضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهو القلب** ''اسی طرح کائنات کے نظام کے ٹھیک ہونے کے لئے انسان کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

۲۹......حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: انسان کے نام کا اشتقاق کچھ بھی ہو، اس میں اس کا اثر ضرور ہوتا ہے، جیسے ہمارے حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کے نام کا اشتقاق درس سے ہے، ان کو ہر وقت درس وتدریس میں دیکھا، ایک دفعہ ہم نے ان سے کہا کہ حضرت! امتحان میں دو دن باقی ہیں، امتحان بھی قریب ہیں، آپ سبق بند فرمادیں تو مسجد کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے کہ: تم تو وہاں جاکر پڑھو گے اور میں کیا کروں گا، گھر پر پڑا رہوں گا؟۔

ایک دفعہ جناح ہسپتال میں زیر علاج تھے، ہم ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو ڈاکٹر سے کہنے لگے کہ: بس! اتنا کردیں کہ میں درس پڑھانے اور نماز پڑھنے کے قابل ہو جاؤں۔

۳۰......ہم نے مشکوٰۃ اول حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ اور مشکوٰۃ ثانی حضرت مولانا محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے پڑھی، مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام میں ذکر کیا جاتا ہے کہ''**حسنات لابرار سیئات المقربین**'' تو ہمیں سمجھ نہ آتا تھا، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ نے اس کی مثال اس طرح پیش کی کہ لوگ نماز پڑھ کر جا رہے ہوں اور ایک آدمی کو اس کا شیخ ڈانٹ رہا ہو کہ تم نے نوافل کیوں نہ پڑھے؟ حالانکہ نوافل ضروری نہیں ہیں، لیکن تربیت کے لئے انداز یہ اختیار کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی تربیت فرماتے ہیں۔

۳۱......حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ فرماتے تھے کہ: حکماء نے لکھا ہے کہ مولی ہاضم ہے، لیکن خود ہضم نہیں ہوتی اور مولوی ومولی میں یہ ایک صفت مشترک ہے کہ مولوی پوری دنیا کو ٹھیک کردیتا ہے، لیکن خود ٹھیک نہیں ہوتا، یہ آپ مزاحاً فرماتے تھے، ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ: مولوی کا معنی ہے اللہ والا، مولا والا، یہاں یاءِ نسبت کی ہے، اصل مولوی وہی ہے جس کو تعلق مع اللہ حاصل ہو۔

علم مولا ہو جسے ہے مولوی
جیسے حضرت مولوی معنوی

۳۲......رقم الحروف ابو حازم مدنی عفا اللہ عنہ کے درجہ سابعہ کے اختتام کے موقع پر حضرت استاذ محترم مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ نے یہ نصیحت اکابر ارشاد فرمائی:

''آپؒ اس فتنہ کے دور میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں دین، مدرسہ، اساتذہ اور طلبہ سے جوڑے رکھا، ورنہ ہم کہاں پھر رہے ہوتے؟ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ نے اپنے آخری سال ختم بخاری کے موقع پر دو بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں: ایک یہ کہ یہ خیال نہ ہو کہ ہم عالم بن گئے ہیں، بلکہ یہ خیال پیدا کریں کہ اب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایسا بن گیا ہوں کہ علماء والا کام کرسکتا ہوں، یہ صلاحیت اللہ نے مجھ میں رکھ دی ہے، یہ بہت بڑا منصب ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی عطا فرمائیں۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ: یا اللہ! تو نے ہم کو جو پڑھنے پڑھانے کی نعمت عطا فرمائی، اس سے محروم نہ فرما۔ یہ بات آپؒ کے حق میں تو پوری ہوئی کہ آپؒ نے اسی سال جامعہ بنوریہ سائٹ میں مشکوۃ شریف کا ختم کروایا، گھر تشریف لائے اور سو گئے اور اسی حالت میں انتقال ہوگیا۔

میں نے سارا سال آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے لئے بھی ہے''وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِیْ ''البتہ جو کچھ کہا ہے وہ''نصحتہ لکم وشفقتہ لکم '' کے تحت کہا ہے، خیرخواہی کے جذبے سے کہا ہے، اساتذہ سے محبت اور ادارہ سے تعلق ہو، یہاں اساتذہ سے ملاقات کے لئے آتے رہیں، ادارہ سے تعلق رکھیں، اس میں بہت فائدہ ہوگا، آپ جب عملی میدان میں قدم رکھیں گے تو آپ کو بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔

راقم الحروف ابوحازم مدنی کہتا ہے کہ آج یہی بات حضرت استاذ شہیدؒ پر صادق آتی ہے، آج ان کی جدائی سے رونا آتا ہے، ان کی باتیں یاد آتی ہیں، جانا تو سب نے ہے، مگر کچھ لے کر جائیں، تاکہ آگے کی زندگی میں مشکل نہ آئے، یہ چند بکھرے موتی تھے جو طلبہ وعلماء کی خدمت میں پیش کردیئے، اس کے علاوہ بھی آپؒ کی بہت سی یادیں اور باتیں دل ودماغ اور ذاتی ڈائری''ایام بلندی'' میں محفوظ ہیں، اس پر اکتفاء کرتا ہوں، آپ کے ملفوظات کا دوسرا حصہ اکابر جامعہ کے ملفوظات اور تیسرا حصہ آپ کے بیان فرمودہ اشعار پر مشتمل ہے۔

حضرت استاذ شہیدؒ نے یہ مذکورہ نصیحت ختم بیضاوی شریف کے موقع پر بروز جمعرات ۴ رجب ۱۴۲۳ھ بمطابق ۱۲ ستمبر ۲۰۰۲ء ارشاد فرمائی۔

''من پدر گم کردہ ام''

مولانا طلحہ منیر صاحب، فاضل جامعہ

جامعہ علوم اسلامیہ کا نام اپنے حفظ کے زمانہ میں سنا تھا کہ عالم اسلام کی مرکزی جامعہ ہے اور بغیر دیکھے ہی دل میں یہ خیال راسخ ہوگیا تھا کہ آئندہ تعلیم وہاں حاصل کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوا اور بندہ ۱۹۹۴ء میں اس عظیم دینی درسگاہ سے منسلک ہوگیا۔

داخلہ کی کارروائی میں ایک مرحلہ انٹرویو کا بھی آیا اور پتہ چلا کہ مسجد کے ہال میں جاکر اس مرحلہ سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہاں طلبہ ایک قطار میں بیٹھے تھے میں بھی جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی باری آگئی اور میں بھی جائزہ لینے والے استاذ محترم کے روبرو جا بیٹھا۔ جن کی کشادہ پیشانی، سیاہ گھنی داڑھی اور ذہانت وفراست سے پُر نگاہیں ایک لمحہ ہی میں حافظہ خیال میں نقش ہوگئیں، کچھ سوالات ہوئے اور داخلہ کی کارروائی مکمل ہوگئی۔ طلبہ سے معلوم ہوا کہ یہ جامعہ کے استاذ اور ناظم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) ہیں۔ اس بات کو لگ بھگ بیس برس ہوگئے ہیں لیکن جب ذرا آنکھیں بند کرتا ہوں تو یہ سارا منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے۔

یہ حضرت مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کبھی جامعہ کی مسجد میں، صحن میں، دفتر میں یا درسگاہ میں آتے جاتے حضرت سے ملاقات ہوجاتی اور میں بھی دیگر طلبہ کی طرح حضرت سے مصافحہ کرلیتا۔ اس زمانہ میں جامعہ میں طلبہ کا وہ ہجوم نہیں تھا جو آج الحمد للہ نظر آتا ہے۔ کراچی کے شہری طلبہ گو کہ بہت کم بھی نہیں ہوتے تھے مگر پھر بھی آجکل کے مقابلہ میں کم ہی ہوتے تھے تقریباً روزانہ ہی حضرت کی زیارت ہوجاتی تھی لیکن حضرت کی ذاتی وجاہت اور بارعب چہرے کی بناپر نہ جانے کیوں ایک رعب سا رہتا تھا اور قریب ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسی اثناء میں عید الاضحیٰ کا وقت قریب آگیا واقفین حال جانتے ہیں کہ جامعہ میں عید الاضحیٰ سے پہلے چرم قربانی جمع کرنے کی ترتیب کیسے بنتی ہے اور پھر عین عید الاضحیٰ کے دنوں میں چرم قربانی کس دینی ولولہ سے جمع کی جاتی

ہیں، اور وہ زمانہ تو مفتی عبدالسمیع صاحب شہید نور اللہ مرقدہٗ کا تھا۔ مفتی صاحب میں جامعہ کی خدمت، اس کی ترقی کا بے لوث جذبہ تھا اور یہی جذبہ ان کے رفقاء کار میں بھی نظر آتا تھا۔ انہی دنوں بندہ نے دیکھا کہ مفتی صاحب شہید نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ جو اساتذہ جامعہ کی اس خدمت میں پیش پیش ہیں ان میں حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید بھی ہیں۔

بندہ کے ذمہ بھی اپنے محلہ میں چرم قربانی جمع کرنا طے پایا۔ اور خوبی مقدر یہ کہ ہمارے حلقہ کے نگران حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب طے پائے۔ اس وقت حضرت سے کچھ گفتگو ہوئی، آپ کی شفقت، محبت محسوس کی، کچھ حجاب ختم ہوا۔ حضرت کی عنایات، بے پایاں الطاف بڑھتے رہے اور پھر روز بروز آپ کی محبت دل و جاں میں پیوست ہوتی رہی تا آنکہ مؤرخہ 20/اپریل بروز جمعۃ المبارک حضرت ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنے پروردگار سے جا ملے۔

حضرت کی تدفین اور حضرت کے اعزہ سے تعزیت کے لیے حضرت کے آبائی گاؤں بابوزئی ابا خیل ضلع مردان جارہا تھا اور ذہن میں ان تمام واقعات کا ایک ہجوم تھا۔ اور مولانا سے متعلق یادداشتوں کا نہ تھمنے والا ایک سلسلہ تھا۔

کیا کیا لکھوں! مولانا کی وجاہت ورعنائی، مولانا کی گونج دار آواز، جامعہ سے عشق کی حد تک لگاؤ، جامعہ کے لیے اپنا تن، من، دھن لگانا، تدریس پر عبور، طلبہ پر شفقت، ایک ایک کا خیال، ایفاءِ عہد، تواضع، للّٰہیت، فنائیت ہر ایک چیز اس کی متقاضی ہے کہ صفحات کے صفحات اس پر لکھے جائیں۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

بہرحال یہ حضرت کے سوانح نہیں بلکہ ایک غم زدہ دل کی تسلی کے لیے اپنے محبوب استاذ کا کچھ تذکرہ ہے:

قِفا نبکِ من ذکری حبیب و منزل
بِسقط اللوی بین الدخول فحومل

یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سانحہ ہوگیا ہے اور مولانا اب ہم میں نہیں رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ابھی فون کی گھنٹی بجے گی اور مولانا اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرمائیں گے۔

جمعہ کے دن مغرب کے بعد حضرت مفتی مزمل حسین صاحب (نائب مدیر اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ) سے یہ روح فرسا خبر سنی تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بے تابانہ جامعہ کی طرف چل پڑا وہاں پہنچا تو ہر طرف سے آہوں اور سسکیوں کی آواز نے بتادیا کہ وہ حادثہ رونما ہو چکا ہے جس کی خلا کا پر ہونا صرف مشیت ایزدی ہی سے ہوسکتا ہے۔

حضرت مولانا بندہ کے استاذ ہیں بندہ نے ان سے سب سے پہلے ''شرح جامی'' پڑھی۔ علوم عربیہ سے واقفیت رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ شرح جامی علم النحو کی کس درجہ کی کتاب ہے اور کس قدر رادق مباحث اس کتاب میں موجود ہیں۔

مولانا سے پہلے یہ کتاب مفتی عبدالسمیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے پاس ہوا کرتی تھی۔ مفتی صاحب کی شہادت کے بعد یہ کتاب حضرت مولانا کے پاس منتقل ہوئی تھی۔ حضرت نے اس کتاب کو ایسا پڑھایا گویا حق ادا کردیا۔ اس کے بعد سابعہ تک تقریبا تمام درجوں میں مولانا سے کچھ نہ کچھ پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔ مولانا کا انداز تدریس بہت عام فہم اور نرالا تھا۔ اکثر درس کے دوران درسگاہ کے آخر میں بیٹھنے والے طلبہ کی طرف دیکھ کر فرماتے کہ میں انکو سمجھاتا ہوں صرف ذہین طلبہ کے سر ہلانے پر مطمئن نہیں ہوتا۔ حضرت بلا کے زیرک تھے۔ طلبہ کے چہروں سے اندازہ لگا لیتے کہ سبق سمجھ میں آرہا ہے کہ نہیں کبھی کبھی اپنے مخصوص انداز میں کسی سے گویا ہوتے کہ'' مولوی صاحب یہ صرف آپ کے لیے'' اور پھر دوبارہ سبق کی تقریر فرماتے۔ جب تک خود کو اطمینان نہ ہو جاتا کہ طلبہ سمجھ گئے ہیں بار بار اس مقام کی تقریر فرماتے۔

دوران درس برمحل اور برجستہ اشعار سناتے جسے بندہ اپنی کاپی میں قلم بند کر لیتا اور بعد میں کبھی حضرت کو سناتا تھا کہ حضرت یہ آپ سے سنا تھا تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا کرتے تھے، کبھی کوئی نصیحت کی بات، کبھی کوئی لطیف نکتہ سناتے اور فرمایا کرتے کہ مولوی صاحب یہ بھی کام کی باتیں ہیں، انہیں اچار چٹنی نہ سمجھا جائے کہ چٹخارہ لیا اور بس بلکہ ان پر عمل کی بھی ضرورت ہے۔ باوجود اپنے بلند مرتبہ اور تدریسی تجربہ کے نچلے درجات میں سبق پڑھانے کو محبوب رکھتے تھے اور ان چھوٹے طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔

مولانا کی شخصیت میں ایک جاذبیت تھی، محبوبیت تھی، جس کو حضرت کا قرب نصیب ہوتا وہ اپنے دل میں مولانا کے لیے محبت محسوس کرتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ کئی بار صرف اس لیے کہ مولانا کی زیارت ہو جائے، مولانا سے کچھ بات چیت ہو جائے، کسی کتاب کو لے کر مولانا کے پاس چلا جاتا کہ حضرت یہ مقام ذرا سمجھا دیجیے اور مولانا پوری بشاشت سے دن رات کے کسی بھی پہر میں اس مقام کی تقریر فرمانے لگتے تھے۔ یوں تو مولانا کی شفقت تمام ہی طلبہ پر ہوا کرتی تھی مگر، وہ طلبہ جن کے گھروں کا ماحول دینی نہ ہو یا ان کے حالات نامساعد ہوں یا شہری ہونے کی بنا پر ان کے خاندان میں علم دین حاصل کرنے کا رواج نہ ہو ان پر ہمیشہ مولانا کی خصوصی شفقت رہا کرتی۔ اور حضرت ہر طریقہ سے ان کا خیال فرمایا کرتے۔ طلبہ کے مدرسہ نہ آنے پر ان کے گھروں پر جا کر ان کو سمجھانا، ان کی ہمت بڑھانا ان کو دوبارہ مدرسہ میں لانا مولانا کا معمول تھا۔

آج مولانا کی ان روحانی اولادوں کے حافظوں میں حضرت کی شفقت کے لاتعداد

واقعات محفوظ ہوں گے بندہ نے بھی حضرت کی شفقتوں سے خوب استفادہ کیا ہے۔امتحانات کے دنوں میں جب بندہ مدرسہ میں مقیم ہوتا تو حضرت پوچھتے صبح ناشتہ کی کیا ترتیب ہے؟اور بندہ کہتا کہ حضرت ناشتہ تو آپ کے گھر ہوگا اور حضرت خوشی سے فرماتے ،''بس یہی سننا تھا''اور صبح حضرت کے دسترخوان پر حضرت کے گھر میں پُرتکلف ناشتے کا بندوبست ایک ایسے طالب علم کے لیے ہوتا جو نہ تین میں تھا نہ تیرا میں ،اور میں ہی کیا حضرت سے تعلق رکھنے والے تمام ہی طلبہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ حضرت استاذ محترم کے روحانی احسانات کی طرح جن کا شمار ہی ممکن نہیں حضرت کے مادی احسانات بھی اتنے ہی وقیع اور ناقابل فراموش ہیں۔بات سے بات نکلتی ہے درجہ سابعہ میں بندہ حضرت کے ایماء پر ایک مسجد میں شام کے اوقات میں کچھ پڑھانے جایا کرتا تھا۔مسجد کے احباب نے اس وقت کا کچھ معاوضہ دینا چاہا جو بندہ نے قبول نہیں کیا،حضرت کو اطلاع ہوئی مجھے بلوایا اور فرمایا کہ یہ معاوضہ میرے کہنے پر طے ہوا ہے لے لو۔اور مجھ سے فرمایا کہ میں تمہیں اور ان لوگوں کو اپنی مسجد بلوالوں گا اور وہاں میں ان سے یہ معاضہ تمہیں دلواؤں گا۔تعمیل حکم کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا وقت مقررہ پر بندہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور ان صاحب سے معاوضہ لے لیا۔واپسی کے سفر میں اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی نے جیب پر ہاتھ صاف کرلیا۔اگلے دن میں نے استاذ محترم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو حضرت نے فرمایا'' کچھ چیزوں کا پاس نہ رہنا ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے، غم کی کوئی بات نہیں۔'' کچھ ہی دنوں بعد امتحانات کے نتائج کے بعد اچھے نتیجہ کی خوشی میں حضرت نے اپنی جیب سے اتنی ہی رقم عطا فرمادی اور یوں گویا اس غم کی تلافی فرمادی۔

حضرت کی غیور طبیعت کا احساس ہے وگرنہ کتنے ہی واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ کرنے کو دل مچلتا ہے۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ حضرت نے ساری زندگی ان تمام طلبہ سے محبت میں اخلاص اور بے غرضی کو بنیاد بنایا تھا اور حضرت اپنی حیات میں بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان واقعات کا افشا ہو۔چنانچہ بس اسی ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کی ایک نمایاں خصوصیت اُن کی معاملہ فہمی اور ایمانی فراست تھی۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت کو اس سلسلہ میں وہ ملکہ حاصل تھا کہ آپ کی نگاہ کھرے اور کھوٹے میں فوراً ہی فرق کرلیا کرتی تھی۔لہٰذا آپ کے متعلقین اپنے ذاتی معاملات بھی آپ سے رجوع کیا کرتے تھے اور حضرت بھی ایسے لوگوں سے جو حضرت سے اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلہ میں مشورہ کرتے تھے'' لـمستشـار مؤتمن'' کے مصداق صائب رائے دیا کرتے تھے اور اس بات پر کہ اپنا سمجھ کر ان سے مشورہ کیا گیا ہے بہت خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔

میں کیسے بھول جاؤں کہ صرف ایک فون کال پر جب بندہ نے حضرت سے کہا کہ حضرت حج پر

جانا ہے اور اس سلسلہ میں آپ سے مشورہ کرنا ہے تو کس خوشی سے پہلے تو حضرت نے مبارکباد دی اور پھر پوچھا کہ آپ کہاں ہیں۔ میرے بتانے پر فرمایا کہ بس میں بھی قریب ہی ہوں آپ سڑک پر آجائیں اور مل لیں۔ رات کے اس پہر میں مولانا اپنے مخلص رفیق اور خادم مولانا سہیل صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر تشریف لائے۔ بندہ نے کہا حضرت آپ کو بڑی زحمت ہوگئی۔ فرمایا نہیں خوشی ہوئی کہ آپ نے مشورہ کے لیے مجھ پر اعتماد کیا اور پھر میری بات سن کر اپنی رائے دی اور تشریف لے گئے۔

اور میں اس سوچ میں غرق کہ کیا میرے لیے بھی ممکن ہے کہ اپنے کسی چھوٹے کی صرف ایک فون کال پر یوں دوڑا چلا آؤں۔ یقیناً نہیں۔ باوجودیکہ میری مشغولی کا ذمہ داری کا حضرت کی مشغولیوں اور ذمہ داریوں سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ لیکن اس کا کیا کریں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھیجتا ہی اس لیے ہے کہ وہ انسانیت کے لیے ایک مثالی نمونہ بنیں۔ لوگوں کو اخلاق اور انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔ ایسے لوگوں کے اپنے اور پرائے سبھی معترف ہوتے ہیں۔ ہمارے حضرت کا بھی یہی حال تھا۔

ذاتیات اور اغراض سے بلند و بالا ہو کر اپنے متعلقین کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا، ان کے مزاج کی رعایت کرنا، حضرت مولانا کا خاصہ تھا۔ اس ضمن میں اگر لکھنا شروع کردوں تو ایک دفتر جمع ہوسکتا ہے۔

قارئین کے لیے شاید اس میں کوئی چاشنی نہ ہو لیکن میرا دل مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہا کہ میں حضرت کی زندگی کے اس عظیم پہلو سے صرف نظر کر کے گزر جاؤں۔ یہ واقعتاً حضرت کی کرامت ہی تھی کہ حد درجہ مشغولی کے باوجود نہ صرف حضرت کو اپنے متعلقین کی خبر رہتی تھی بلکہ ان کی راحت رسانی کے ہر ممکن کام کا صدور حضرت سے ایسے ہوتا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔

ہمارے تخصص کے سال حضرت پر عرق النساء کا شدید حملہ ہوا۔ وہ دن ویسے بھی بڑے عجیب تھے۔ حضرت مفتی نظام الدین شامزئی شہید نور اللہ مرقدہٗ کی شہادت کا سانحہ تازہ تازہ تھا۔ جامعہ کے در و بام پر ایک غم و مایوسی کی چادر تھی ہر ایک مفتی صاحب کی رحلت پر افسردہ تھا۔ اور حضرت مولانا پر تو غم کی ایک الگ ہی کیفیت تھی کہ حضرت کا حضرت مفتی صاحب سے ایک الگ ہی رشتہ تھا گو کہ حضرت مولانا مفتی صاحب کے شاگرد نہیں تھے لیکن مفتی صاحب کی عزت ایسے ہی کرتے تھے جیسے ایک شاگرد استاذ کی عزت کرتا ہے بارہا بندہ نے حضرت مولانا کو حضرت مفتی صاحب کی چپل سیدھی کرتے دیکھا اور دوسری جانب حضرت مفتی صاحب کو حضرت مولانا سے محبت تھی اور حضرت مولانا کی آمد پر حضرت مفتی صاحب کا رخِ انور پھول کی طرح کھل جاتا تھا۔ بندہ نے حضرت مفتی صاحب کی شہادت سے پہلے کئی دفعہ تخصص کی درسگاہ میں حضرت مفتی صاحب کو سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھے دیکھا اور پھر حضرت مولانا کی آمد پر حضرت کے رخِ انور کو پھول کی طرح کھلتے دیکھا۔

حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں کہ ''مولوی صاحب! ہمارے مولانا کے لیے اچھی سی چائے لاؤ''، پھر مولانا ہوتے، مفتی صاحب ہوتے مولانا امداد اللہ صاحب بھی اکثر اس نشست میں شریک ہوتے کبھی کبھار مفتی جمیل خان شہید صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھی ہوتے اور خوش مزاجی اور دل بستگی کا ایک دور دورہ ہوتا۔ اب تو ان حضرات میں سے سوائے حضرت مولانا امداد اللہ صاحب متعنا اللّٰہ بطول بقائہ فینا کے سوا سارے ہی حضرات اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ کے فضل سے کیا بعید کہ اب یہ مجلس وہاں لگتی ہو جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے" مالا عینٌ رأت ولا أذن سمعت" فرمایا ہے۔
ایک طرف تو حضرت مفتی صاحب کی رحلت کا غم دوسری جانب حضرت مولانا پر درد کا شدید حملہ کئی دن حضرت مولانا جامعہ کے مہمان خانہ میں مقیم رہے۔

اپنے گھر جو کہ جامعہ کے سامنے ہی ہے تشریف نہ لے جا سکے۔ انہی دنوں ایک طالب علم بندہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ کو استاذ جی بلا رہے ہیں بندہ مہمان خانہ گیا تو حضرت نے فرمایا کہ گھر سے چائے آئی ہے آپ کے لیے رکھی ہے پی لیں۔ اور یہ صرف اس پر ہے کہ ایک دفعہ بندہ نے حضرت سے کہا تھا کہ حضرت آپ کے گھر جیسی چائے کہیں نہیں پی، بہت مزیدار ہوتی ہے۔

خدانخواستہ اس واقعہ کے ذکر سے مقصود اپنی کسی فضیلت کا اظہار نہیں، یہ صرف اس خدا رسیدہ بزرگ کی زندگی کی ایک جھلک ہے۔ کہ ایک دفعہ کے تذکرہ پر حضرت کے ذہن میں یہ بات رہ گئی اور اس بیماری کے عالم میں بھی یہ بات حضرت کے ذہن سے فراموش نہ ہوئی۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اپنے متعلقین کی خوشی کی خاطر باوجود حالات کی خرابی اور بدامنی کے حضرت کا ان کی خوشی، غمی میں شریک ہونا، صرف ملاقات کے لیے مستقل سفر کرنا جماعتوں میں نکلے ہوئے طلبہ کی نصرت کرنا، آنے والے مہمانوں جن میں اکثریت طلبہ ہی کی ہوتی ان کے خیال میں دیر تک ان کے ساتھ بیٹھے رہنا، ان کے لیے دسترخوان وسیع کرنا اور سارا دن جامعہ میں موجود رہ کر جامعہ کے تعلیمی اور انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرنا اور اپنے آرام وراحت کا بالکل خیال نہ رکھنا حضرت کی ایسی خصوصیات ہیں کہ بھلائے نہیں بھولتیں۔

سال گزشتہ کے ماہِ دسمبر میں بندہ کا ویسٹ انڈیز (جزائرغرب الہند) کا سفر طے ہوا جہاں بندہ کی دو بہنوں کا سسرال بھی ہے یہ سفر ان لوگوں سے ملاقات اور تیسری ہمشیرہ کی نکاح کی تقریب کے سلسلہ میں تھا۔ میرے بہنوئی بھی حضرت کے شاگرد حضرت کے عاشق زار اور حضرت کے خصوصی

متعلقین میں سے ہیں۔ ان حضرات نے حضرت مولانا سے فرمایا کہ آپ بھی تشریف لائیں کیوں کہ ہماری خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں۔ حضرت کا ان دنوں برطانیہ جانے کا ارادہ تھا، بکمال شفقت اس دعوت کو قبول کیا۔

ویسٹ انڈیز کے جزیرے ٹرینیڈاڈ تشریف لے گئے بندہ بھی ایک طویل سفر کر کے وہاں پہنچا اور یوں زندگی کے کچھ حسین ترین دن حضرت مولانا کی رفاقت میں گزرے۔ اس جزیرہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ نہیں ہے البتہ تبلیغ کی محنت ہورہی ہے جماعتیں کام کرتی ہیں مساجد موجود ہیں اور بہر حال کچھ نہ کچھ مسلمان بھی ہیں۔

اسی جزیرہ میں میرے ان عزیزوں کا ایک مدرسہ ہے، اقرأ کی ترتیب پر ایک اسلامی اسکول اور مسجد بھی ہے جہاں الحمدللہ وہ اپنی وسعت سے بڑھ کر دین کا کام کررہے ہیں۔ اس ادارہ میں پورے ملک سے طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ حضرت مولانا کو ان نامساعد حالات میں دین کا کام کرنے والوں سے ایک خاص محبت تھی۔ چنانچہ مولانا نہ صرف ان کے استفسار پر ان کی راہنمائی فرماتے بلکہ اس ادارہ کو اپنا سمجھتے ہوئے ازخود بھی ان کی راہنمائی فرمادیتے۔ تقریباً دو ہفتے صبح، شام، دن رات حضرت کے ساتھ گزرے۔ کیا عرض کروں کہ اس سفر کی یادوں کے کیسے کیسے دیپ ہیں جو ان شاء اللہ تادمِ مرگ اس حقیر کے دل میں روشن رہیں گے۔

مولانا کا تہجد میں اُٹھ کر نماز میں مشغول ہونا، ازخود مدرسہ کے تمام امور میں دلچسپی لینا ان کے لیے نصاب کی تیاری میں سرپرستی کرنا، اپنی طرف سے پوری کوشش کرنا کہ ان کی وجہ سے کسی کو مشقت نہ ہو، وہاں رہتے ہوئے بھی پاکستان کے تعلق والوں سے مستقل رابطہ رکھنا۔ طویل طویل سفر کر کے مختلف جگہوں پر جا کے دعائیں کرنا کہ وہاں مدرسہ بنے، مسجد بنے دین کا کام شروع ہو دارالعلوم ٹرینیڈاڈ میں جا کر بیان کرنا جہاں کے موجودہ مہتمم مفتی وسیم صاحب بھی حضرت کے شاگرد ہیں۔

ان میں سے کچھ بھی تو ایسا نہیں جسے فراموش کرسکوں۔ اسی سفر کے دوران مولانا کے لیے ایک بلاوا بارباڈوز سے بھی آیا جو ویسٹ انڈیز کا ایک جزیرہ اور مستقل ملک ہے۔ مولانا چند دنوں کے لیے وہاں بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے خصوصیت سے گجراتی احباب نے حضرت مولانا سے خوب استفادہ کیا۔

مولانا نے بندہ سے فرمایا کہ میرا بارباڈوز کا سفر حرم کی برکت سے ہوا ہے اور پھر خود ہی فرمایا کہ ایک دفعہ میں حرم مکی میں زمبیا کے احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا اس نے مجھ سے کہا ''تم بارباڈوز نہیں آتے؟'' میں نے کہا ضرور آؤں گا۔ بس یہی وہاں کے سفر کا وسیلہ بن گیا وگرنہ وہاں کے ویزے کا حصول آسان نہیں ہے۔

گو کہ اصلاً مولانا کراچی سے انگلینڈ کے لیے نکلے تھے اور وہاں مختلف شہروں میں مشتاقین شدت سے آپ کی آمد کا انتظار کررہے تھے لیکن مولانا نے زیادہ عرصہ وہیں ویسٹ انڈیز میں گزارا اور فرمایا کہ ان لوگوں کا خلوص اور محبت جانے نہیں دیتا۔

آخر میں چند دن کے لیے انگلینڈ بھی تشریف لے گئے اور وہاں سے سعودیہ عرب پہنچے اور عمرہ کی سعادت اور حرمین کی حاضری کے بعد پاکستان پہنچے۔

اس کے علاوہ کئی ممالک کا سفر حضرت نے صرف بلانے والوں کے خلوص اور محبت پر قبول فرمایا اور وہاں تشریف لے جاکر دین کا کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ زمبیا، ساؤتھ افریقہ کے کئی اسفار فرمائے وہاں جامعہ کے فضلاء نے جو مدارس قائم کررکھے ہیں ان کے دورے کیے وہاں قیام فرمایا، سرپرستی فرمائی۔

حرمین سے بھی حضرت کو خصوصی لگاؤ تھا، حضرت کی اور حضرت کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا امداد اللہ صاحب کی آرزو ہمیشہ سے یہی رہتی کہ کہیں کا بھی سفر ہو کوئی ترتیب ایسی بن جائے کہ آتے یا جاتے یہ سعادت نصیب ہوجائے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کوئی نہ کوئی ترتیب بنا ہی دیتے تھے۔

مضمون طویل ہورہا ہے مگر حضرت کی یادیں ختم نہیں ہورہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کیوں کہ ہمارے حضرت نے اپنی زندگی میں دین کی مختلف جہات میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

وَمَا هُلْكُ قَيْسٍ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

ایک طرف حضرت جامعہ علوم اسلامیہ کے قدیم استاذ اور ناظم تھے ابتداء ہی سے جامعہ کی تعلیمی شوریٰ کے رکن تھے۔ ایک دفعہ حضرت خود فرمانے لگے کہ میرے ابتدائی تقرر کے زمانہ میں جب تعلیمی کمیٹی کوئی مشورہ کرنے بیٹھتی تو مفتی ولی حسن صاحب فرمایا کرتے ''یہ اچھا آدمی ہے اس کو بھی بٹھاؤ''۔ آپ حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید نور اللہ مراقدھا کے خصوصی معتمد تھے۔

حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب کی شہادت کے بعد آپ جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب متعنا الله بطول بقائه فينا کے دست و بازو بنے اور حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب کی بیماری اور پھر رحلت کے بعد جامعہ کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور جامعہ اور شاخہائے جامعہ میں تعلیم کے اسی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے شب و روز کوشاں رہے جو جامعہ کا خصوصی امتیاز ہے، تو دوسری جانب آپ تا دمِ رحلت کراچی کی مرکزی مسجد جامع مسجد صالح جہانگیر پارک کے امام و خطیب بھی رہے۔ بندہ کے اندازے کے مطابق شاید کراچی شہر میں جمعہ میں سب

سے زیادہ نمازی اسی مسجد میں ہوتے ہیں۔

الحمدللہ بندہ کو بھی حضرت کی نیابت میں اس مسجد میں جمعہ اور عید پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اور بندہ نے حضرت سے عرض بھی کیا کہ آپ کی مسجد میں جمعہ پڑھانے کا بڑا لطف آتا ہے کہ بیان شروع ہونے سے پہلے ہی مسجد بھر جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہمارے استاذ جی کے اخلاص ہی کا ثمر تھا کہ آپ کی سیدھی سادھی لیکن دل میں اُتر جانے والی تقریر کو سننے کے لیے مجمع پہلے ہی سے مسجد میں آ بیٹھتا تھا اور اسی مسجد سے اللہ تعالیٰ نے حضرت سے اس مقبول کام کی ابتداء کرائی جسے لوگ ''تعلیم وتربیت کورس'' کے نام سے جانتے ہیں اور الحمدللہ دنیا کے کئی ممالک میں آج یہ کورس پڑھایا جارہا ہے۔

حضرت کے دل میں یہ ارمان اور خواہش تو تھی کہ نئی نسل سے دین کی دوری ختم ہو۔ ابتدا ہی سے ان کی تربیت دینی رُخ پر ہوسکے، ان کے دلوں میں دین کی محبت اور عظمت ہو اور اس سلسلہ میں مولانا حتی الوسع کوشش بھی فرماتے تھے اور اپنی مسجد میں اس سلسلہ میں کوئی نہ کوئی نظم بھی بناتے تھے۔

لیکن مولانا کی آرزو یہ تھی کہ اس سلسلہ میں کوئی ایسی ترتیب بنائی جائے جس کے نتائج دوررس ہوں پہلے قدم کے طور پر حضرت استاذ محترم نے اسکول وکالج کی گرمیوں کی تعطیلات میں اپنی مسجد میں اس کورس کا آغاز کیا جس میں قریبی دکانداروں کے بچوں نے داخلہ لیا اور یوں پڑھائی کا آغاز ہوا۔

بندہ اس وقت غالباً درجہ خامسہ یا سادسہ کا طالب علم تھا۔ استاذ جی کی دوررس نگاہوں نے اس کورس کی افادیت کو بھانپ لیا تھا لہٰذا حضرت نے اپنے تعلق رکھنے والے طلبہ اساتذہ اور دیگر متعلقین کو اس کورس کی طرف متوجہ فرمایا اور اس سلسلہ میں اس سے آئندہ سال بندہ اور کچھ طلبہ کو جامع مسجد محمدی فیڈرل بی ایریا بلاک ۱۷ بھیجا جہاں حضرت کے کچھ متعلقین نے جن کا تعلق گودھرا برادری سے تھا، کورس کا انتظام کیا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کورس کے مراکز میں اضافہ ہوا۔ مولانا ایسے تمام لوگوں کی سرپرستی فرماتے ان کے مراکز میں تشریف لے جاتے ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ رفتہ رفتہ اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اس کورس کے لیے مختلف عمر کے طلبہ کے معیار کے مطابق مختلف کتابیں ہونی چاہئیں، مولانا نے اس پر کام شروع کیا۔

بندہ بھی ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہے جن پر حضرت استاذ محترم نے اعتماد فرمایا اور ان کو شامل کار فرمایا۔ حضرت مفتی نظام الدین صاحب شامزئی نوراللہ مرقدہٗ بقید حیات تھے حضرت نے بھی بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور یوں اس کورس کی تالیف کا حتمی کام شروع ہوا۔

بڑے سہانے دن تھے دار التصنیف میں حضرت استاذ جی اور ہم چند طلبہ اور اساتذہ

ہوتے اور حضرت ایک ایک عبارت ، جملہ اور لفظ لفظ پر بحث فرماتے اور اچھی طرح مطمئن ہوکر اسے کتاب میں شامل فرماتے ۔

کتاب کی تکمیل پر حضرت کی مسرت کا عالم دیدنی تھا یہ حضرت کی للّٰہیت ، اخلاص اور جامعہ کی برکات ہی ہیں کہ آج یہ کورس کئی ممالک میں پڑھایا جارہا ہے ۔ اس درجہ عظیم خدمت کے بعد حضرت کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ اس کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ اس کتاب میں حضرت کا تذکرہ بھی ہو ۔ حقوق طباعت بھی جامعہ کے دارالتصنیف کے حوالے فرمائے اور ایسے ہوگئے گویا اس عظیم خدمت میں ان کا کوئی کردار ہی نہ ہو ۔ میری ناقص رائے میں تو حضرت کا یہ تجدیدی کارنامہ ہی ان شاء اللہ ہمیشہ حضرت کے تذکرہ خیر کا ذریعہ بنا رہے گا ۔

موت تو برحق ہے اس سے کسی کو مفر نہیں جو آیا ہے جانے کے لیے آیا ہے لیکن ہمارے حضرت ان شاء اللہ ہمیشہ اپنے ان دینی آثار کی شکل میں ہم میں موجود رہیں گے ۔ آج حضرت کے خدام ، حضرت کے تلامذہ جہاں جہاں بھی دینی خدمات میں مشغول ہیں ، ان کی ان خدمات کے اجر میں حضرت مولانا کا پورا پورا حصہ ہے کیوں کہ استاذ جی نے ہمیشہ ان کی راہنمائی فرمائی ہے حوصلہ بڑھایا ہے ۔ دین کے لیے سب کچھ لگادینے کا جذبہ ان میں پیدا کیا ہے ۔ اگر میں اپنی ہی بات کروں تو میرا اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ سے منسلک ہونا وہاں خدمات انجام دینا اس میں حضرت کی توجہات ، سرپرستی شامل ہے ۔ یہ حضرت ہی تھے جنہوں نے تخصص کے زمانہ میں مجھے اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ سے منسلک ہونے کی اجازت دی ۔ اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے ہی بزرگوں کا ادارہ ہے اس کی خوب خدمت کرو ۔

اس عظیم سانحہ سے ایک ہی دن قبل مؤرخہ 19 / اپریل بروز جمعرات میری ہمشیرہ کے ولیمہ میں حضرت تشریف لائے تھے ، بڑا ہی پرمسرت موقعہ تھا عصر کے بعد بندہ نے حضرت سے موبائل پر رابطہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں ضرور آؤں گا اور میرے ساتھ مولانا عرفان صاحب اور دیگر حضرات بھی ہوں گے ۔ جامعہ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا امداد اللہ صاحب اور حضرت مفتی عاصم ذکی صاحب دامت برکاتہم بھی اس دعوت میں تشریف لائے ۔

کھانا شروع ہونے میں حضرت مولانا شہید کا انتظار کیا جارہا تھا بندہ کے رابطہ کرنے پر حضرت نے فرمایا کہ ہم ناظم آباد پہنچ چکے ہیں لیکن آپ ہمارا انتظار نہ کیجیے کھانا شروع کروادیجیے ۔ بندہ نے تعمیل ارشاد میں ایسا ہی کیا ۔

تھوڑی ہی دیر میں حضرت تشریف لے آئے ہم استقبال کے لیے دروازے پر آئے تو سلام کے بعد حضرت نے فوراً کھانے کے بارے میں پوچھا کہ شروع کردیا کہ نہیں؟ بندہ نے عرض کیا حضرت ! الحمدللہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوچکی ہے ۔ اس پر حضرت نے خوشی کا اظہار فرمایا ۔ اگر میں

یہ کہوں کہ مولانا اس تقریب میں بطور مہمان نہیں بلکہ بطور میزبان شامل ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ اس نکاح، رخصتی اور ولیمہ میں شروع سے آخر تک حضرت مولانا کی سرپرستی ہمیں حاصل رہی ۔

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا امداد اللہ صاحب، مفتی عاصم زکی صاحب، مولانا عرفان صاحب میرے والد محترم اور دیگر حضرات ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کررہے تھے اور دل بستگی کا ایک دور دورہ تھا ۔

کیا معلوم تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت ہے اور اب قیامت تک یہ آنکھیں حضرت کی زیارت سے محروم رہیں گی ۔ کافی دیر تک یہ حضرات اس دعوت میں شریک رہے اور پھر اپنی اپنی منزل کو روانہ ہوگئے اور اس کے بعد تو حضرت وہاں تشریف لے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا ۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی سعید روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور جامعہ اور دین کے جس جس شعبہ میں حضرت کے جانے سے خلا واقع ہوا ہے اپنے کرم سے اس خلا کو پُر فرمائے، حضرت کے اعزہ، حضرت کے والدین، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے، خصوصیت سے اللہ تعالیٰ میرے استاذ محترم مولانا امداد اللہ صاحب کو صبر نصیب فرمائے کہ مولانا مرحوم سے حضرت کی رفاقت کئی عشروں پر محیط تھی اور اب حضرت کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گئے ہیں ۔ اس حادثہ میں جن جن گھرانوں پر قیامت ٹوٹی ہے اللہ سب ہی کو اپنے شایانِ شان بدلہ نصیب فرمائے ۔

حق تلفی ہوگی اگر مولانا کے اس تذکرے میں اپنے دوست مولانا عرفان صاحب شہید نور اللہ مرقدہٗ کا تذکرہ نہ کروں کہ وہ اب استاذ جی کے صاحب فی المزار بھی ہیں ۔ مولانا عرفان صاحب کو ہمارے استاذ محترم سے بہت محبت تھی اور انہوں نے اپنا آپ گویا استاذ جی کے لیے وقف کررکھا تھا، جب کہ دوسری جانب استاذ جی کو بھی مولانا مرحوم سے بہت لگاؤ تھا ۔ جب بھی مولانا مرحوم پر استاذ جی کی شفقت دیکھی تو ہمیشہ رشک آیا ۔ کہتے ہوئے تو عجیب سا لگتا ہے لیکن کہہ ہی دیتا ہوں کہ اگر مولانا عرفان مرحوم اس حادثہ میں شہید نہ ہوئے ہوتے تو حضرت کی جدائی کے صدمہ میں چل بستے ۔ لیکن اللہ نے ان کو اس غم سے محفوظ رکھا اور حضرت کے ساتھ ان لازوال نعمتوں میں شریک کرلیا جو خاص اسی کی عطا اور دین ہیں ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

یہ شعر جس کے لیے بھی کہا گیا ہو بہرحال ہمارے مولانا عرفان صاحب نور اللہ مرقدہٗ اس کے مصداق ٹھہرے ہیں ۔ اللہ ان کے پسماندگان کو بھی صبر جمیل نصیب فرمائے ۔

باتیں اُن کی یادرہیں گی

مولانا محمد کامران اجمل
متخصص جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کومختلف طبائع عطاکیں اور ہرشخص کومختلف صلاحیتوں سے نوازا،کسی میں ایک خوبی رکھی توکسی کودوسری خوبی کے ذریعہ ممتازکیا،کسی پراپناخاص فضل فرماکرکئی خوبیوں سے نوازااور یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں کہ اپنے کسی خاص بندے کوتمام خوبیوں سے نوازدے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر
أن یجمع العالم فی واحد

تمام صفات وکمالات سے متصف ذات توصرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے،اس کے علاوہ مختلف خوبیوں سے متصف اشخاص کواللہ تعالیٰ مختلف اوقات میں پیدافرماتے رہتے ہیں اوران سے اپنے دین کے مختلف شعبوں میں کام لیتے ہیں،انہیں اشخاص ورجالِ کارمیں سے ایک ہمارے استاذمحترم حضرت مولاناعطاء الرحمٰن شہیدؒ بھی تھے،جنہیں خداتعالیٰ نے بہت سے کمالات سے نوازا،بہت خوبیاں عطاکیں،جن کی زندگی قابل رشک تھی،جن کی شہادت سے بہت سی آنکھیں اشکبارہوئیں، بہت سے دماغوں پراس غم نے اثرکیا،بہت سے دل ابھی تک اسے تسلیم کرنے سے قاصرہیں۔

استاذمحترم سے چھبیس،ستائیس سال کے عرصے میں ایک بہت بڑی جماعت نے استفادہ کیا،بہت بڑی کھیپ ان کے دورِتدریس ونظامت میں تیارہوئی،ہزاروں طالبانِ علوم نبوت نے ان کے سامنے بیٹھ کرفرامینِ رسول کوسیکھا،سینکڑوں خطباء ومقررین پیداہوئے،ان حضرات واشخاص کی تعدادبھی کم نہیں،جنہوں نے بالواسطہ یابلاواسطہ ان سے تحریرسیکھی،اپنے مضامین کی نوک پلک سنواری،اپنے قلموں کے ذریعے دعوتِ دین کاکام سرانجام دیا۔اس کالازمی نتیجہ ہے کہ ان کے دنیاسے جانے کے بعدبہت سارے حضرات نے ان پرلکھااورلکھ رہے ہیں،درج ذیل تحریرکوئی مضمون یاخاص سوانح نہیں،بلکہ چندمنتشرواقعات کوجمع کرکے ان سطورمیں جمع کیاہے،گومرتب نہیں،لیکن خوداپنے ساتھ بیتے ہوئے چندواقعات یااصل راویوں سے سنے ہوئے چندقصے ہیں،جن

میں ان کی چند صفات کا بیان ہے۔ استاذ محترم کی صفات بہت زیادہ تھیں، کسی کی صفات کو کما حقہ بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ علامات ودلائل سے ان کی صفات پر استدلال کیا جاتا ہے اور واقعات وقصص ان صفات کی طرف اشارہ کرتے اور دلیل بنتے ہیں، اسی لئے ذیل میں صرف چند واقعات ان کی مختلف صفات پر بیان کئے جارہے ہیں۔

قوتِ حافظہ

اللہ تعالیٰ نے استاذ محترم کو بے پناہ حافظہ عطا فرمایا تھا، اکثر باتیں انہیں اچھی طرح یاد رہتیں، کئی کام کافی سال گذرنے کے بعد بھی یاد رہتے اور ضرورت پڑنے پر یاد دلاتے تھے، بلکہ بسا اوقات صاحبِ واقعہ وہ بات بھول جاتا اور استاذ محترم کو یاد رہتی تھی۔ مکہ مسجد کے ایک فاضل مولانا حمید الرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ: ''جب میں مکہ مسجد میں درجہ رابعہ میں پڑھتا تھا اس وقت دانت کی تکلیف کی وجہ سے جامعہ آیا تھا، کلینک میں مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے تکلیف کا پوچھا، میں نے دانت کے درد کا ذکر کیا، پھر مزید چار سال میں نے مکہ مسجد میں پڑھا، جب تخصصِ علومِ حدیث کے لئے جامعہ آیا تو داخلہ کے کچھ عرصہ بعد استاذ جی سے ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے: ''حمید! تمہارے دانت کا درد کیسا ہے''؟

ایک مرتبہ جامعہ کے ایک فاضل دبئی جانا چاہتے تھے، استاذ محترم نے اپنے چھوٹے بھائی کو بتلایا کہ جامعہ کا فاضل آرہا ہے، ان کا ذرا خیال رکھیں، پھر کسی وجہ سے وہ صاحب وہاں نہ جاسکے، اس واقعہ کو کئی سال گذر گئے، صاحبِ واقعہ کے بھائی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ پرانا ہونے کی وجہ سے ہمیں یاد بھی نہ تھا، لیکن استاذ جیؒ نے شہادت سے کچھ عرصہ پہلے پوچھا کہ تمہارے بھائی دبئی جانا چاہتے تھے، پھر گئے تھے یا نہیں؟ صاحب واقعہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی اور مجھے صحیح یاد بھی نہ تھی، لیکن استاذ محترم کو بخوبی یاد تھی۔ دورانِ درس اکثر گزشتہ اسباق کا حوالہ دے کر فرماتے: ''یہ بات آپ نے فلاں کتاب میں پڑھی ہے، وہاں یوں مذکور ہے'' وغیرہ۔ کسی طالب علم کو دیکھ لیتے، نام معلوم کر لیتے تو برسوں وہ نام یاد رکھتے تھے اور بسا اوقات نام لے کر مخاطب کرتے تھے۔

احتیاط وورع

احتیاط وورع کی صفت استاذ محترم میں بے حد پائی جاتی تھی، احتیاط بھی بہت فرماتے، لیکن اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک بار گھر میں کسی رشتہ دار کے ہاں سے پلیٹوں میں کوئی چیز آئی، پلیٹیں دیکھیں تو وہ جامعہ کے مطعم کی پلیٹوں سے مشابہ تھیں (اگرچہ جامعہ کی نہ تھیں لیکن) فرمانے لگے: یہ پلیٹیں فوراً جن کی ہیں، انہیں بھجوادو۔

ایک طالب علم تخصص میں داخلہ کا خواہشمند تھا، اور امتحان دے کر کامیاب بھی ہو چکا تھا، استاذ محترم کو یہ معلوم تھا کہ یہ طالب علم داخلہ کا خواہشمند ہے، لیکن یہ علم نہ تھا کہ اس کا داخلہ ہو چکا ہے، اس طالب علم نے استاذ جیؒ کے جوتے اٹھا کر ان کے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو استاذ محترم نے منع فرمایا اور پھر پوچھا: داخلہ ہوگیا؟ طالب علم نے بتایا کہ: ہاں! ہوگیا، تب اسے جوتے دیئے اور فرمایا: ''اصل میں بعض طلبہ جوتے اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارا داخلہ ہو جائے گا، اس لئے میں نہیں دینا چاہتا تھا، اب چونکہ تمہارا داخلہ ہو چکا ہے، لہذا اٹھالو۔ ایک بار ایک طالب علم نے مطالعہ کے لئے کتاب استاذ محترم کو دی، مطالعہ کرنے کے بعد کسی طالب علم کے ہاتھ بھجوائی، پھر ملاقات کے وقت کئی بار پوچھا کہ آپ کو آپ کی کتاب مل گئی یا نہیں؟ اور ایسا کئی ملاقاتوں میں کیا۔

وفاداری

حضرت استاذ محترم مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ کا ایک خاص وصف جو ہر خاص وعام جانتا تھا ان کی وفاداری تھی، وفاداری میں تو گویا استاذ جی ضرب المثل تھے، چھوٹے سے چھوٹے سفر میں بھی اگر کوئی ساتھ ہوتا اس کا پورا خیال رکھتے اور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک نکاح میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، ایک طالب علم سواری لے کر حاضر ہوا، نکاح پڑھانے کے بعد کچھ کھانے کا انتظام تھا، استاذ محترم نے فرمایا: ''آپ کی جو ترتیب ہے، ذرا جلدی کریں، میرے اس ساتھی کو کہیں جانا ہے۔'' صاحب خانہ نے آسانی کی غرض سے کہا کہ: ''اگر یہ جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں، آپ آرام سے کھانا کھالیں، سواری کا بندوبست ہے، آپ کو گھر پہنچادیں گے''۔ استاذِ محترم غصہ ہوئے، فرمانے لگے: ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ یہ میرا ساتھی ہے، میں اس کو ویسے ہی نہیں چھوڑ سکتا، میں اس کے ساتھ آیا ہوں، اسی کے ساتھ جاؤں گا''۔

ایک مرتبہ تعلق والے کی دعوت میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، ایک طالب علم کو بھی وہیں جانا تھا، اسے بھی ساتھ لے لیا، دعوت والی جگہ پہنچ کر دیکھا تو اساتذہ بیٹھے تھے اور استاذ محترم کو ساتھ بٹھانا چاہا تو فرمایا: ''آپ بیٹھیں'' اور ایک الگ جگہ جا کر اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے جن کے ساتھ آئے تھے اور اس طالب علم کو بھی ساتھ بٹھایا اور واپسی میں بھی ساتھ لے گئے۔

ایک دفعہ مولانا عرفان شہیدؒ پر ڈاکو نے پستول رکھی اور موٹر سائیکل چھیننے کا ارادہ کیا، استاذ محترم نے دیکھا تو فوراً اس ڈاکو پر جھپٹ پڑے، آپ کو منع بھی کیا گیا، لیکن استاذ جی پیچھے نہ ہٹے، اس شخص نے پستول استاذ جی کی طرف پھیر کر ٹریگر کو دبایا بھی، لیکن گولی نہ چل سکی۔ غرض وفاداری میں اپنی زندگی بچانے کی فکر کے بجائے اپنے ساتھی کا ساتھ دیا، اگرچہ موت بالکل سامنے تھی۔

استاذ محترم حج وعمرہ پر جانے کو خوب پسند کرتے بھی تھے اور ہر سال کوشش بھی فرماتے، جس

سال نہ جاسکتے تو پریشان اور مغموم رہتے تھے، لیکن وفاداری کی صفت کا اس قدر غلبہ تھا کہ بسا اوقات اپنی محبوب ترین چیز حج وعمرہ کو بھی قربان کردیتے۔ آخری یعنی موجودہ سال حج پر اس وجہ سے نہ جاسکے کہ ایک فاضل نے استاذ جی کا پاسپورٹ لے کر ویزے کی کوشش کی، لیکن ویزا نہ لگ سکا، پھر استاذ محترم نے ان کا پاسپورٹ لے کر خود ویزا لگوانے کی کوشش کی تو جواب ملا کہ آپ کا ویزا لگ جائے گا، دوسرا نہیں لگ سکتا، چونکہ اس فاضل نے پہلے استاذ جی کے لئے کوشش کی تھی، اس لئے استاذ جی نے فرمایا کہ: میرے ایک نہیں دو پاسپورٹ ہیں، دونوں کے ویزے لگ سکتے ہیں تو جاؤں گا، ورنہ نہیں۔ اس فاضل نے بہت اصرار کیا کہ استاذ جی! آپ کا ویزا لگ رہا ہے تو آپ چلے جائیں، میں پھر چلا جاؤں گا، لیکن استاذ جی نے فرمایا کہ: نہیں! جب تک دونوں ویزے نہ لگے ہوں، نہیں جاؤں گا اور بالآخر نہیں گئے۔ (اگرچہ مغموم بہت تھے، لیکن وفاداری کی وجہ سے نہیں گئے)۔

سنجیدگی ووقار:

اللہ تعالیٰ نے حضرت شہیدؒ کو سنجیدگی ومتانت سے بھی خوب نوازا تھا، بہت زیادہ خوشی کا موقع ہو یا انتہائی غمگین معاملہ ہو، کبھی غیر سنجیدہ نہ ہوئے، اگرچہ ہنسی کے موقع پر کھل کھلا کر ہنس بھی لیتے تھے، لیکن کبھی کوئی خلافِ وقار کام آپ سے سرزد ہوتے نہ دیکھا گیا۔ ایک سال کلاس میں اپنے مخصوص انداز میں شعر سنائے، کچھ طلبہ نے داد دینے کے لئے سبحان اللہ کہا، بہت غصہ ہوئے اور فرمانے لگے: ''یہ درس گاہ ہے، اس کے وقار کو خراب نہ کرو، کوئی جلسہ گاہ نہیں کہ تم داد دے رہے ہو، تم میں سے بہت سارے ویسے ہی سبحان اللہ کہہ رہے ہیں اور وہ اس شعر کا معنی تک نہیں سمجھے ہوں گے''۔ غرض انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا، پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے گھنٹے میں اس قسم کی آواز نکالے۔

حضرت مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر بہت سارے صبر وتحمل کے پہاڑ بھی اس جانکناہ حادثے کی وجہ سے نڈھال تھے، لیکن استاذ محترم مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ اس موقع پر بھی صبر وتحمل سے رہے اور اس موقع پر بھی غیر سنجیدہ یا جذباتی کوئی بات نہ کی، البتہ انتہائی شدید صدمہ ہونے کی وجہ سے صرف اس قدر دیکھا کہ مہمان خانے کے باہر بینچ پر بیٹھے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹیکے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے آنے کی صورت میں طلبہ میں بدنظمی کو بالکل برداشت نہ کرتے، بلکہ یہی تلقین کرتے کہ باوقار رہو، اس طرح کسی کے سامنے جم گھٹا بنانا وقار کے خلاف ہے۔ ٹھیک ہے مہمان کی محبت وعظمت ہو، لیکن اس طرح نہیں کہ انسان بے وقاری کا مظاہرہ کرے۔

رعب وکشش:

انتہائی سنجیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رعب بھی اس قدر عطا فرمایا تھا کہ ہر کسی کی مجال نہ

تھی کہ ان کے سامنے کسی قسم کی حرکت کرے، البتہ جو استاذ محترم کے قریب ہو جاتا وہ اس قدر محبت میں سرشار ہو جاتا کہ پھر ان کے پاس سے ہٹنے کو دل نہ چاہتا تھا، انہیں دیکھ کر وہ منظر بالکل سامنے ہوتا تھا کہ ''من رأٰہ بداھۃً ھابہٗ ومن خالطہ معرفۃً أحبہٗ''۔ یعنی جو انہیں دور سے دیکھتا تو مرعوب ہوتا اور جو طلبہ ان کے قریب جاتے وہ ان سے اس قدر محبت کرتے کہ گھنٹہ ختم ہوتے ہی استاذ جی کو تلاش کر کے ان کے پاس جانے کی کوشش کرتے۔

حضرت لدھیانوی شہیدؒ کی شہادت کے موقع پر کچھ لوگ جہانگیر روڈ کی ٹریفک بند کر رہے تھے، استاذ محترم دیگر اساتذہ سمیت گاڑی میں طلبہ کو جامعہ بھیجنے کے لئے چکر لگا رہے تھے، جب گاڑی جہانگیر روڈ پہنچی تو ایک صاحب نے ڈنڈے کے ذریعے ان کی گاڑی روکنے کی کوشش کی اور سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، بندہ نے جب دیکھا تو اسے بتایا کہ: جامعہ کے اساتذہ ہیں، کہنے لگا: سب کے لئے ایک حکم ہے، جب اس نے گاڑی روکی، شیخ عطاءؒ گاڑی سے اترے اور اسے کہا کہ: گاڑی میں بیٹھو، اس شخص نے جب استاذ محترم کو دیکھا تو بہت گھبرایا اور معافی مانگنے لگا، تب حضرت شہیدؒ نے فرمایا: ''میری ضمانت پر بیٹھ جاؤ'' بعد میں جب اسے دیکھا تو ایسا پرسکون تھا گویا کچھ دیر پہلے والا شخص نہیں۔ بہر حال خدائے تعالیٰ نے استاذ محترم کو رعب وکشش عطا فرمائی تھی، وہ انہیں کا خاصہ تھا، بہت سارے لوگ ان کی کشش کی وجہ سے ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے تھے، ایک مرتبہ قریب آئے تو پھر اسی محفل کے ہو کر رہ گئے اور یوں گویا ہوتے:

تری آباد محفل میں جو ہم نے دن گزارے تھے
قلم لکھنے سے قاصر ہے وہ لمحے کتنے پیارے تھے

ایک بار مسجد علیؓ میں استاذ محترم مولانا عادل صاحب مدظلہ کے کمرے میں تشریف فرما تھے، کسی نے آ کر جب دور سے دیکھا کہ حضرت شہیدؒ موجود ہیں تو واپس چلا گیا، ایک چھوٹے بچے نے آ کر حضرت شہیدؒ سے کہا: ایک آدمی آپ کو دیکھ کر بھاگ گیا، فرمانے لگے: ''ہاں غلط آدمی میرے سامنے آنے سے ڈرتا ہے، جو آدمی صحیح ہوگا وہ مجھ سے بھاگے گا نہیں'' گویا نہ جاننے والا اس قدر گھبرا جاتا تھا کہ:

یذیب الرعب منہ کل عضب
فلولا الغمد یمسکہ لَسَالَا

اخفاءِ حال واخلاص:

استاذ محترم حضرت شہیدؒ پر اخفاءِ حال کا بے حد غلبہ تھا کہ نام ونمود کو بالکل برداشت نہیں کرتے تھے، کبھی کسی نے سابقہ لاحقہ کے ساتھ نام لینا چاہا تو سختی سے منع فرما دیتے تھے، عبادات وادعیہ کو اس طرح چھپایا تھا کہ ''أسمعت من ناجیت'' کا اس زمانہ میں ایک عملی نمونہ تھے، کبھی

عبادات کو نہ ظاہر کرتے اور نہ کسی سے اس کے بارے میں سننا پسند کرتے، اس قدر اپنے آپ کو چھپایا کہ کبھی کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ تصوف، اہل تصوف اور سلوک کی راہوں سے بھی کچھ تعلق ہے یا نہیں؟ بلکہ بارہ تیرہ سال ان کی شفقتیں محبتیں دیکھ کر اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کسی سے بیعت بھی کی ہے یا نہیں؟

چالیس روزہ کورس کی نصابی کتابوں کے نگرانی کے لئے رات دیر تک بیٹھے رہتے اور اپنی زیرِ نگرانی تمام کتابیں مکمل کروائیں، لیکن اپنا نام تک نہ دیا، بلکہ تقریظ یا پیش لفظ تک خود نہ لکھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ نے تقریظ میں استاذ جیؒ کا نام لکھا تو وہ نام کٹوا دیا۔

اخفاء حال کا اس قدر غلبہ تھا کہ ایک اللہ والے کے بقول: ''ساری زندگی، میں دو آدمیوں کے تعلق مع اللہ کے بارے میں شک میں رہا، لیکن جب عمرہ کے سفر میں انہیں دیکھا، ان کی عبادت وریاضت دیکھی، تب معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات اللہ تعالیٰ سے کس قدر تعلق رکھنے والے تھے، ان میں سے ایک مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ تھے اور دوسرے مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ۔

تواضع

تواضع وانکساری اس قدر تھی کہ جامعہ بنوری ٹاؤن جیسے عالمی ادارے کا ناظم تعلیمات ہونے کے باوجود عام بسوں میں یا موٹر سائیکل وغیرہ پر سفر فرماتے تھے، کبھی یہ مطالبہ نہیں کہ کوئی گاڑی ہو یا کوئی پروٹوکول۔ ایک بار وفاق المدارس کی طرف سے مراکز کے دوروں کے لئے روانہ ہوئے تو ایک استاذ کو ساتھ لیا اور ایک بس کے ذریعے ایک مرکز پہنچے، وہاں سے نکل کر دوسری بس میں سوار ہوئے، اسی طرح مختلف مراکز کا دورہ بسوں کے ذریعے کیا اور آخر میں جامعہ فاروقیہ کے قریب پہنچ کر فرمایا: کچھ کھا لیتے ہیں اور پھر عام لوگوں کی طرح کچھ امرود وغیرہ لے کر وہیں بیٹھ کر کھائے اور یہ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ کوئی بڑے عالم ہیں یا جامعہ کے ناظم تعلیمات۔

دنیا سے بے رغبتی

مولاناؒ کے دل میں دنیا سے بے رغبتی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے بہت کچھ بنا سکتے تھے، اپنے منصب اور جاذبیت کے باوجود ان کا طرزِ زندگی اُن کی دنیا سے بے رغبتی پر واضح دلیل ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی دنیا سے بے رغبتی ہی ایسی چیز تھی، جس نے ان کو اتنا جاذب نظر انسان بنایا تھا، سچ ہے: ''**ازهد في الدنيا يحبك الله وازهد فيما عند الناس يحبك الناس**''۔ ہمیشہ مسافروں کی سی زندگی گزاری، کراچی میں پینتیس سال سے زیادہ قیام، صدر کی مرکزی جامع مسجد میں امامت اور نظامت تعلیم کے باوجود اپنے لئے کوئی عالی شان مکان نہ

بنوایا، بلکہ کراچی میں کوئی مکان بنایا ہی نہیں، اور گاؤں میں بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے، بلکہ طلبہ اور اپنے صاحبزادوں کو یہ سمجھایا کرتے تھے کہ: ''یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہمارے والدین نے ہمارے لئے کچھ چھوڑا نہیں''۔

ایک مرتبہ بندہ صبح مدرسہ کے لئے آرہا تھا، جہانگیر روڈ پر دیکھا کہ استاذ محترم اکیلے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں، بندہ نے جاکر پوچھا کہ: استاذ جی! کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ فرمانے لگے: ''ایک جاننے والے کے رشتہ دار کا سہراب گوٹھ میں انتقال ہوا ہے، ان کی تعزیت کے لئے جارہا ہوں'' میں نے عرض کیا: ''استاذ جی! گاڑی؟ فرمانے لگے: ''یہ ساری گاڑیاں ہماری ہی تو ہیں، ابھی W-11 آجائے گی اور بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔ ایک عزیز کے بقول: استاذ جیؒ کے والد محترم مدظلہ العالی نے زمین خریدی، تو عزیز کے سامنے استاذ جی نے فرمایا: ''مجھے یہ چیزیں سمجھ نہیں آئیں، بس جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو وہ ملے، باقی یہ زمینیں وغیرہ مجھے سمجھ نہیں آتیں''۔ ایک استاذ صاحب فرمانے لگے: استاذ جیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ''ہم ناظموں کا کیا ہے؟ ادھر اپنے کپڑے اور سامان وغیرہ اٹھایا اور چل دیئے اور ہماری ہے ہی کیا چیز؟''۔

استغناء

یہی دنیا سے بے رغبتی تھی جس کی وجہ سے استاذ محترم کسی سے مرعوب نہ ہوتے اور کسی سے کسی چیز کی توقع اور امید نہ رکھتے، بلکہ استغناء کا معاملہ رکھتے تھے، باوجود سب کچھ کے اپنی وضع قطع ایسی رکھی تھی کہ بالکل ان کے بارے میں پتہ نہ چل سکتا تھا، کبھی کسی مال والے کی طرف جھکاؤ نہ کرتے، بلکہ ہمیشہ مخلصین کا چناؤ فرماتے، چاہے وہ مالدار ہو یا غریب۔

طلبہ و متعلقین پر شفقت

شفقت کی صفت استاذ جیؒ کی ذات میں علی وجہ الاتم پائی جاتی تھی، کبھی کسی طالب علم یا متعلق کو پریشانی میں مبتلا دیکھتے تو فوراً اس کی مدد کی کوشش کرتے، کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا یا کسی دوسری پریشانی میں مبتلا ہوتا کوشش یہی کرتے کہ کسی طرح اس کا یہ مسئلہ حل ہو جائے، اور یہ راحت وسکون پالے۔

بندہ کا جب جامعہ میں تقرر ہوا تو یہاں تک پوچھا کرتے تھے کہ کس راستے سے آتے ہو؟ فلاں راستے کے بجائے اگر فلاں راستہ اختیار کرو تو زیادہ بہتر ہے، آتے کس طرح ہو؟ کس کے ساتھ آتے ہو؟ راستہ میں احتیاط سے آیا کرو اور دعاؤں وغیرہ کا خوب اہتمام کیا کرو، راستوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، کس وقت سے کس وقت تک جامعہ میں ہوتے ہو؟ غرض ایک ایک چیز کے بارے میں خبر گیری فرماتے اور جہاں کوئی خیر خواہی و ہمدردی کی بات ہوتی تو اپنی پدرانہ شفقت کی

بناء پر صحیح طریقہ اور ترتیب سمجھاتے تھے۔

استاذ محترم کے ایک شاگرد کے ساتھ سفر میں چوری کا حادثہ ہوا، استاذ جیؒ کو اس ساتھی کے والد کے ذریعے علم ہوا، گھنٹہ بعد اسے فون کرکے ارشاد فرمایا کہ: پولیس یا دیگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فلاں استاذ سے بات کر چکا ہوں، انہیں فون کرلیں، وہ تمہیں ترتیب سمجھا دیں گے، یعنی صرف سن کر تسلی ہی نہیں دی، بلکہ اس کے لئے کوشش بھی کی، جب رابطہ وغیرہ کر چکے تب اپنے شاگرد کو فون کیا۔

ایک طالب علم کے والد کا کسی کے دھکا دینے سے انتقال ہوا، اس طالب علم کا استاذ محترم سے کوئی خاص تعلق بھی نہ تھا، بلکہ مدرسہ میں اس کا پہلا سال تھا اور حضرت شہیدؒ سے کچھ پڑھا بھی نہ تھا، لیکن جب استاذ محترم کو معلوم ہوا فوراً اس کے ساتھ تعاون کے لئے مدرسہ کے امور متفرقہ کے ایک ذمہ دار شخص کو فون وغیرہ کرکے باخبر کیا اور ان کے ذریعے پولیس وغیرہ کی کارروائی بھی مکمل کروائی اور آخر تک تمام مراحل میں اس طالب علم کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔

کبھی کسی طالب علم کی چھٹی کا مسئلہ ہو یا اس میں صلاحیت دیکھیں اور اس کے داخلے کا مسئلہ ہو تو اس کے لئے کوشش فرماتے تھے، اور بسا اوقات مصروف ہونے کی صورت میں کسی کے ذمے لگاتے کہ اس کے ساتھ رہو اور داخلے وغیرہ کا طریقہ کار بتلاؤ، جب اس کا داخلہ ہو جائے تب مجھے بتلانا۔

شاگردوں کی حوصلہ افزائی

حضرتؒ اپنے شاگردوں میں کوئی صلاحیت دیکھتے تو انہیں اس کام میں آگے بڑھانے کی مکمل کوشش کرتے، ایسا بھی ہوا کہ طالب علم میں صلاحیت دیکھی اور اسے ترغیب دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ استاذ محترم کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے بہت آگے ترقی کر گیا۔ اپنے ساتھیوں میں اکثر دیکھا کہ جب کسی باصلاحیت ساتھی کو استاذ محترم نے دیکھا، اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ آج بھی بعض بہت قابل اور باصلاحیت اساتذہ کے بارے میں معلوم کیا جائے تو شیخ عطاءؒ کی تشجیع اور آگے بڑھانے کی کوشش کارفرما نظر آئے گی۔ ایک استاذ محترم کے بقول جب ہم فارغ ہوئے اور سال کے لئے جماعت میں گئے تھے تو حضرت شہیدؒ رائے ونڈ تشریف لائے اور فرمایا: اگلے سال کیا کروگے؟ میں نے عرض کیا: جیسا آپ حضرات فرمائیں، فرمانے لگے: جامعہ میں درخواست دے دو، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ تقرر وغیرہ کے لئے کوشش بھی فرمائی تھی۔

بے تکلفی

اپنی بے حد حساسیت کے باوجود ہمیشہ بے تکلف رہا کرتے اور بے تکلفی کو پسند فرماتے تھے، استاذ کے ساتھ ملنے کا معاملہ ہو، راستے پر چلنے کا معاملہ ہو، کھانے پینے کا معاملہ ہو، حتی کے اٹھنے بیٹھنے کا

معاملہ ہو، ہر چیز میں بے تکلفی کو پسند کرتے تھے، کسی کو تکلف کرتے ہوئے دیکھتے تو بے حد بوجھ محسوس کرتے تھے، اسی سال کی ابتداء میں پٹیل پاڑہ میں مولانا عادل صاحب مدظلہ کے چچا کے جنازے میں شرکت کے لئے تشریف لائے، نمازِ جنازہ پڑھائی، طلبہ جنازہ کے بعد استاذ جیؒ کے پاس جمع ہو گئے بندہ سے پوچھا: جامعہ جاؤ گے؟ بندہ نے عرض کیا: جاؤں گا، فرمانے لگے: بس میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا، باقی ساتھیوں سے فرمایا: آپ حضرات تکلف نہ کریں، بس قبرستان کی طرف جانا ہوتو جائیں، بندہ کا ابتداءً ارادہ تھا کہ قبرستان چلا جائے، لیکن استاذ جی کی وجہ سے ارادہ ملتوی کرلیا، استاذ جی نے بھانپ لیا، ایک اور فاضل جامعہ ہی کی طرف جارہے تھے، بندہ سے فرمایا: آپ قبرستان چلے جائیں، میں نے عرض کیا: میں آپ کے ساتھ چلا جاتا ہوں، فرمانے لگے: تکلف کی ضرورت نہیں، یہ اسی طرف جارہے ہیں، میں ان ساتھ چلا جاتا ہوں، آپ بے تکلف قبرستان چلے جائیں۔

ایک بار فجر کی نماز میں استاذ جیؒ سے ملاقات کے لئے جامعہ گیا، اتفاق سے استاذ جی ہی کے ساتھ نماز میں کھڑا ہونے کا موقع ملا، نماز کے بعد ادباً تھوڑا سا پیچھے ہٹا تو فرمایا: آگے ہو جاؤ، بندہ آگے ہوا تو رخ تھوڑا سا استاذ جی کی طرف پھیرا، پھر فرمایا: سیدھے بیٹھو۔ اس قدر تکلف کو بھی اپنے بارے میں برداشت نہیں فرماتے تھے۔ جب طلبہ مسجد میں بطورِ مہمان جاتے اور بیٹھنے میں ذرا احتیاط کے انداز میں بیٹھتے، فرماتے: بے تکلف ہو کر بیٹھو! گویا اپنی زندگی میں صحابہ کرامؓ کی خاص صفت ''أقلهم تكلفاً'' پر خوب عمل پیرا تھے اور اپنے عمل سے گویا یہ ظاہر فرماتے کہ:

اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر
اچھے ہیں وہ لوگ جو تکلف نہیں کرتے

تحقیقی مزاج

اللہ تعالیٰ نے تحقیقی مزاج خوب عطا فرمایا تھا، چالیس روزہ کورس کی کتابوں کے مرتب کرتے وقت دعاؤں، ان کے الفاظ کے تلفظ اور ان کی صحت کا خوب التزام فرماتے اور تحقیق کرواکر لکھواتے۔ دورانِ درس بہت مواقع ایسے آئے جہاں پر استاذ محترم کسی لفظ یا بحث کی تحقیق فرماتے تو اسے خوب واضح دلائل کے ساتھ ثابت فرماتے تھے، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اس بحث کی تحقیق ذہن میں مستحضر نہ ہوتی اور کوئی اشکال پیدا ہو جاتا تو جب تک وہ حل نہ ہو جاتا سکون نہ ملتا اور اس کا بار بار تذکرہ فرماتے رہتے، بلکہ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا کہ سبق پڑھایا اور پڑھانے کے بعد بھی اس پر خوب غور فرماتے رہے، اگلے دن آکر دوبارہ اس سبق میں مزید مثالوں سے سمجھاتے، اگر غور وفکر ومزید تحقیق کے بعد اپنی بات درست معلوم نہ ہوتی اور کلاس کے کسی طالب علم نے صحیح رائے ذکر کی ہوتو اگلے دن آکر اس سے دوبارہ پوچھتے اور فرماتے: اس نے جو بتایا تھا، وہی صحیح تھا

اور اس کی صحت کی وجہ بتاتے۔ شہادت سے کچھ عرصہ قبل دورانِ درسِ حدیث ایک روایت میں ذکر آیا کہ: ''ایمن غلام حضرت عائشہؓ کے پاس گھر گیا'' استاذ محترم نے اس کی تحقیق کی کہ یہ ایمن غلام کون ہے؟ صاحب فتح الباری نے ان کے بارے میں کوئی خاص بات اس حدیث کے ضمن میں ذکر نہیں کی، البتہ علامہ عینیؒ نے ذکر کی ہے کہ یہ تابعی ہیں اور ''ابن ابی عمرو المخزومی القرشی'' کے مولیٰ ہیں۔ اس پر اشکال یہ تھا کہ جب حضرت عائشہؓ کے محرم نہ تھے تو ان کے پاس جانے کا ذکر کیسے ہے؟ اس کا جواب علامہ عینیؒ نے یہ دیا ہے کہ: ''ودخول أيمن على عائشةؓ إما إنه كان قبل آية الحجاب أو من وراء الحجاب''۔ حضرت استاذؒ فرماتے کہ: یہ آیۃ الحجاب سے پہلے کیسے ممکن ہے؟ جبکہ ایمنؒ مذکور کو علماء نے تابعی لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ آیۃ الحجاب کا نزول حضور ﷺ کے زمانے میں ہوا تو پھر ایک تابعی کا آیۃ الحجاب سے پہلے جانے کا کیا مطلب ہے؟ اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ چھوٹے ہیں، مخضرمین میں سے بھی نہیں۔ غرض ابھی اس کی تحقیق پوری نہ ہوسکی اور طلبہ کے ذمہ بھی لگا رکھا تھا کہ آپ حضرات بھی معلوم کریں، ابھی استاذ محترم کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تھی کہ داعئ اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اسی طرح دعاؤں وغیرہ میں بھی جن الفاظ کے بارے میں فرماتے کہ: یہ الفاظ احادیث کی کتابوں میں نہیں ملے، بہت تلاش کے باوجود بھی بندہ کو وہ الفاظ نہ مل سکے اور بات وہی صحیح پائی جو استاذ محترم نے فرمائی تھی۔

درود شریف کا اہتمام

حضرت شہیدؒ سے پڑھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سبق کے دوران جب آقائے نامدار ﷺ کا نام گرامی لیتے تو اس پرکیف اور پرلطف انداز سے لیتے کہ پوری درس گاہ ان کی آواز سے گونج اٹھتی اور درود شریف کے پڑھنے کا انداز اتنا عمدہ ہوتا کہ سامنے والا درود شریف کے پڑھنے پر گویا مجبور ہوتا۔ اکثر درس گاہ میں فرماتے تھے کہ: ''مجھ سے درود کا پڑھنا سیکھ لو، درود صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھا کرو، جلدی کی وجہ سے درود کا حلیہ نہ بگاڑو'' اس بات پر اکثر تنبیہ فرماتے کہ: ''ابھی صحیح نہیں پڑھو گے تو پھر فارغ ہو جاؤ گے اور صحیح درود پڑھنا بھی نہیں آئے گا''۔

درود شریف کا اس قدر اہتمام تھا کہ کمپیوٹر میں پہلے سے محفوظ شدہ درود لکھنے سے منع کرتے، بلکہ فرماتے کہ درود پورا لکھا کرو۔ یہ پہلے سے محفوظ شدہ درود نہ لکھا کرو، یہ درود جب تک لکھا رہے گا، تمہارے لئے باعثِ اجر وثواب ہوگا، ہم نے مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ سے یہی سیکھا ہے۔

اکابر پر اعتماد

اکابر پر اعتماد جو حضرت شہیدؒ کے ہاں دیکھا وہ قابل رشک وتقلید تھا، ہر وقت اکابر پر اعتماد

کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے: ''اکابر پر اعتماد کرنا سیکھو''۔ بات بات میں تنبیہ فرماتے کہ خدارا! شذوذ اختیار نہ کرو، اپنی باتوں کے منوانے کے چکر میں نہ رہو، بلکہ یہ اکابر جو کہیں ان کی مانو، بہت سارے فتنوں سے نجات پاؤ گے، یقیناً یہ بات صحیح ہے: ''**البرکة مع اکابرکم**''۔

ان کی عادت مسلم شریف میں یہ تھی کہ ''**حدثنا**'' سے پہلے جہاں لفظ ''**قال**'' نہیں لکھا ہوتا وہاں لفظ ''قال'' نہ پڑھتے تھے، بندہ نے ایک بار تدریب الراوی کی وہ بحث جہاں ''قال'' کے وجوب کا ذکر ہے، استاذ محترم کو مسجد کے برآمدے میں جاکر دکھائی، فرمانے لگے: ''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہم نے اپنے اساتذہ سے نہیں سنا ہے، اس لئے نہیں پڑھتا''۔ جب بندہ تخصص فی علوم الحدیث میں داخل ہوا تب معلوم ہوا کہ اس پر ''محمد بن احمد بنیس الفاسیؒ'' نے مستقل رسالہ ''**رسالة فی جواز حذف قال عند قولهم حدثنا**'' لکھا ہے جو ''**خمس رسائل فی علوم الحدیث**'' میں چھپ چکا ہے۔ سبحان اللہ! اکابر پر اعتماد سکھانے کا کتنا انوکھا انداز تھا؟! یقیناً یہ کتاب استاذ محترم کی نگاہوں سے گزری ہوگی، مگر بجائے کتاب کا نام لینے کے نسبت اساتذہ کی طرف کی کہ: ''ہم نے اپنے اساتذہ سے نہیں سنا''۔

چہرہ شناسی وفراست

ویسے تو بندہ حضرت استاذ محترم کے بارعب چہرہ، گرج دار آواز، وجیہ شخصیت سے درجہ حفظ سے ہی آگاہ تھا، لیکن اس زمانے میں صرف اس قدر جانتے تھے کہ امتحان کے نتائج کے موقع پر نتائج کا اعلان کرنے والے ہیں، اس کے علاوہ نہ ان کا نام آتا تھا، نہ کچھ اور خبر تھی۔ جب درجہ اولیٰ میں داخلہ لینے آیا تو سب سے پہلی صفت جو استاذ جی کی دیکھی وہ ان کی چہرہ شناسی اور فراست تھی، داخلہ وقت دارالحدیث کے پہلے دروازے کے قریب استاذ جیؒ اور مولانا عادل صاحب مدظلہ ایک ساتھ بیٹھے جائزہ لے رہے تھے، دارالحدیث کے اندر اور درس گاہ سے باہر ایک لمبی قطار داخلہ کے خواہشمند طلبہ کی لگی تھی، بندہ جب جائزہ دینے کے لئے قریب بیٹھا اور جائزہ دینے لگا تو خادم کو آواز دی اور دور بیٹھے ایک خواہشمند کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ: اس کا سرٹیفیکٹ لے آؤ، خادم صاحب جب اس لڑکے کے قریب پہنچے تو استاذ محترم کا اشارہ دیکھنے کی وجہ سے فوراً بھاگ گیا، استاذ محترم نے فرمایا: ''میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ اس کی سند جعلی ہے''۔ پھر ایک اور کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بھی لے آؤ، جب اس سے سند لائی گئی تو اس سے کہا: سچ بتاؤ، یہ سند جعلی نہیں؟ اس نے کہا کہ: اصلی ہے۔ خادم سے کہا: اسے روکے رکھو، وہ بھی بھاگ گیا، پھر فرمایا: اسے سند دے دو اور لائن میں بیٹھنے مت دو۔ ایک بار بندہ دفتر میں استاذ محترم کے پاس بیٹھا تھا، ایک شخص دفتر میں داخل ہوا، استاذ محترم نے دیکھتے ہی فرمایا: ''فلاں مسلک سے تعلق رکھنے والا ہے'' (حالانکہ اس کے چہرے سے مکمل طور پر واضح نہ تھا) قریب بیٹھے دوسرے استاذ صاحب نے فرمایا کہ: یہ کیسے کہا

آپ نے؟ استاذ جیؒ نے بندہ سے فرمایا: جاکر وہ قریب بیٹھے ہوئے استاذ سے پوچھ آؤ، استاذ نے بتایا: ''فلاں مسلک کی کسی تنظیم کے سربراہ ہیں''۔ اور یہ اسی مسلک کا ذکر کیا جو استاذ جیؒ نے فرمایا تھا، اس پر حضرت شہید رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ: ''جب یہ دفتر سے داخل ہوا، میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہے''۔

داخلوں کے ایام میں ایک داخلے کا خواہشمند طالب علم استاذ جیؒ کے پاس آیا اور چالیس روزہ کورس کے بارے میں پوچھنے لگا، حضرت شہیدؒ نے ایک طالب علم کو بلوا کر فرمایا: اس کی بات سنو اور اسے کورس کے بارے میں سمجھاؤ، جب یہ شخص طالب علم کے ساتھ بیٹھا، طالب علم نے اسے سمجھانا شروع کیا تو یہ توجہ نہیں دے رہا تھا، پھر خود ہی اس طالب علم کو بتایا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ میں کورس کی بات کر کے استاذ جی کے قریب ہو جاؤں گا اور پھر اپنے داخلے کی بات کروں گا، وہ طالب علم بھی اس سے رخصت ہو گیا، جب استاذ محترم سے ملاقات ہوئی تو استاذ جی نے اس شخص کے بارے میں پوچھا تو طالب علم نے اس کا مقصد بتایا، استاذ محترم نے فرمایا: ''میں سمجھ گیا تھا، اسی لئے آپ کے حوالے کیا تھا''۔ ایک بار کسی نے عاملوں کا ذکر کیا کہ وہ ماں کا نام پوچھ کر اس شخص کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں، فرمانے لگے: ''مجھے ماں کا نام مت بتاؤ، اس شخص کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دو، میں اس کے بارے میں بتاتا ہوں کہ کیا کیا کرتا ہے''۔

جامعہ کے ساتھ خلوص

جامعہ کے ساتھ اس قدر خلوص ومحبت کا تعلق تھا کہ جامعہ کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے تھے اور ہر اس فرد وشئے سے محبت کرتے جس کا جامعہ سے تعلق ہو۔ ایک بار استاذ محترم جامعہ کے شرقی دروازے سے بنات کے مدرسہ میں پڑھانے تشریف لے جا رہے تھے، بندہ بھی ساتھ ہو گیا، ایک شخص نظر آئے، استاذ جی نے انہیں سلام کیا، پھر ان کی سختی کا ذکر کیا، پھر فرمانے لگے: ''یہ شخص مجھ سے بسا اوقات سخت لہجہ میں بھی بات کرتا ہے اور برے انداز سے ملتا ہے، لیکن یہ شخص چونکہ جامعہ کے ساتھ مخلص ہے، اس لئے مجھے محبوب ہے، اور جو شخص جامعہ کے ساتھ مخلص ہو، مجھ سے اگر چہ اس کا رویہ اچھا نہ ہو، میں پھر بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔

اقرباء پروری سے اجتناب

حضرت شہیدؒ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ مولاناؒ اقرباء پروری سے مکمل اجتناب فرماتے تھے، جبکہ دیگر بعض عام طلبہ کے کاموں میں بڑی خوش دلی سے کوشش فرماتے۔
اقرباء پروری سے اجتناب کی ایک واضح مثال ان کی اولاد، ان کے سب سے قریبی ساتھی اور

بھائی وغیرہ ہیں، ان کے ہر وقت حاضر باش رفقاء اور دوست مولانا عرفان شہیدؒ، مولانا سہیل صاحب اور مولانا آصف صاحب وغیرہ جامعہ کے فضلاء ضرور ہیں، لیکن طویل رفاقت کے باوجود جامعہ کے باقاعدہ اساتذہ نہ تھے ۔خود استاذ محترم کے بھائی اور اولاد اس قدر قابل ہیں کہ جامعہ میں تقرر سے کوئی مانع اور رکاوٹ موجود نہ تھی (جبکہ ہر فاضل کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ادارے سے تادم آخر منسلک رہے، لیکن) ان حضرات میں سے کوئی بھی جامعہ میں استاذ یا کسی شعبہ میں نہیں، ان کے بھائی مولانا لطف الرحمٰن صاحب اور حفظ الرحمٰن صاحب باقاعدہ پوزیشن لینے والے طلبہ میں سے تھے، ان کے صاحبزادے مولانا مسیح الرحمٰن صاحب اور مولانا فصیح الرحمٰن صاحب بھی قابل طلبہ میں سے تھے، لیکن اب تک ان میں سے کوئی بھی جامعہ کا استاذ نہیں بنا، بڑے صاحبزادے مولانا مسیح الرحمٰن صاحب کو گاؤں میں اپنے والد صاحب کی خدمت میں لگایا، وہ وہیں دادا محترم کی خدمت اور تدریس میں مصروف ہیں ۔

تربیت

حضرت شہیدؒ تربیتِ طلبہ کا اس قدر اہتمام فرمایا کرتے تھے گویا خدا نے اسی غرض سے پیدا کیا ہو، لباس و پوشاک سے لے کر، اٹھنے بیٹھنے، بلکہ خدمت تک کے بارے میں معمولی غفلت پر فوراً تنبیہ فرماتے اور تربیت کا ایسا انداز اختیار فرمایا کرتے تھے کہ زندگی بھر وہ بات بھولتی نہ تھی، جامعہ کے تمام اساتذہ وطلبہ ان کی تربیت کے شاہد عدل ہیں، سب ہی ان کی صفت سے بخوبی واقف ہیں ۔ یہاں ان کی تربیت کرنے کے چند واقعات پیش خدمت ہیں:

۱...... سلام کے معاملے میں آج کل عموماً کوتاہی ہوتی ہے، طلبہ، عوام وخواص اکثر ہی سلام کے معاملے میں مختلف قسم کی غفلتوں میں مبتلا ہیں، بعض سلام ہی نہیں کرتے، بعض سلام مصافحہ کو سمجھتے ہیں، بعض سلام کے الفاظ میں کوتاہی کرتے ہیں ۔

حضرت استاذ جیؒ اس پر سخت تنبیہ فرماتے، کئی بار بیان میں اس رواج کی تردید وتشنیع کی اور صحیح انداز میں سلام کرنے کا حکم دیا، فرمایا کرتے تھے کہ: یہ طلبہ مصافحہ کرتے ہیں، سلام نہیں کرتے، بسا اوقات صرف مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ پکڑ کر فرماتے کہ: زبان سے سلام بھی کرو۔

۲...... ایک بار عمرے کا سفر تھا، بندہ کو علم ہوا کہ فجر کے بعد استاذ جیؒ تشریف لے جائیں گے، بندہ فجر کی نماز میں جامعہ حاضر ہوا، حسنِ اتفاق سے صف میں استاذ جیؒ کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع ملا، نماز کے بعد ادباً معمولی سا پیچھے ہوا، تاکہ بیٹھنے میں برابری نہ ہو، ہاتھ کے اشارے سے آگے ہونے کا فرمایا، جب میں آگے ہوا تو رُخ ادباً استاذ جیؒ کی طرف پھیرا، اس پر پھر قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا فرمایا، دعا ہوجانے کے بعد کہا: ''شاید آپ ملنے آئے ہوں گے'' اور مصافحہ اور دعا وغیرہ کر کے رخصت فرمایا: بندہ جب مسجد سے باہر آیا تو دیکھا کہ کافی طلبہ انتظار میں

کھڑے ہیں، جب استاذ محترم مجلس کے دروازے کے قریب پہنچے تو طلبہ نے ملنا شروع کیا اور معانقہ کرتے رہے، بندہ کے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ یہ طلبہ تو یہیں کے رہائشی ہیں، میں تو دور سے ملاقات کے لئے آیا ہوں اور مجھے مصافحہ کرکے رخصت کردیا، میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ استاذ محترم نے آواز دی اور اپنے پاس بلایا، بندہ نے جلدی سے جاکر معانقہ کیا، حضرت شہیدؒ فرمانے لگے: ''اس وقت معانقہ اس لئے نہیں کیا کہ لوگ سوچتے کہ یہ کہاں جارہا ہے؟ وہ لوگ بھی ملنے آتے، ان پر بوجھ ہوتا، اس لئے وہاں نہیں ملا''۔

۳...... درجہ ثانیہ میں بندہ ہدایۃ النحو کی کاپی موڑ کر لکھ رہا تھا، جس سے گتے پر بھی اثر پڑ رہا تھا، استاذ محترم نے کچھ کہنے کے بجائے ہاتھ سے کاپی لی اور سیدھا کرکے فرمایا: ''اب لکھو، موڑو مت'' استاذ محترم کا انداز اس قدر دل نشین تھا کہ اب تک دوبارہ کاپی موڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

۴...... کچھ طلبہ مجلس دعوت وتحقیق کے راستے کے بیچ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے، استاذ محترم گاڑی میں تشریف لائے اور اپنے مخصوص انداز میں اُنہیں فرمایا: ''بیچ میں کھڑے ہو کر گفتگو کرلو'' یہ سن کر وہ طلبہ تو فوراً ہٹ گئے، لیکن وہاں سے گزرتے ہوئے یہ منظر ہمارے لئے اتنا مؤثر مربی ثابت ہوا کہ اب راستہ کے بیچ میں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

۵...... ایک طالب علم گیلے ہاتھ استاذ محترم سے ملانے لگا تو فرمایا: ''ہاں دو چار سے مزید ملالو، تاکہ تمہارے ہاتھ سوکھ جائیں''۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ اب کسی کے ساتھ تر ہاتھ نہیں ملا سکتے۔

۶...... خدمت کرنے والے سے چائے اگر ساسر میں گر جاتی یا ٹرے میں، تو تنبیہ فرماتے اور اسے اٹھا کر کسی چیز سے صاف کرنے کا فرماتے۔ ان کی تربیت کے اس قدر واقعات ہیں کہ خود مستقل ایک رسالہ اس پر لکھا جائے تب جاکر کچھ حصہ سامنے آئے، ان کے شاگرد اساتذہ ہوں یا طلبہ سب ہی کی ہر وقت تربیت فرماتے تھے، آج اساتذہ اور طلبہ کو اپنے ایک محسن وشفیق استاذ کے جانے کے غم کے ساتھ ساتھ اپنے مربی ومصلح شیخ اور والد کے گم ہونے کا غم بھی ہے۔

چالیس روزہ کورس

حضرت استاذ شہیدؒ کے جہاں اپنے شاگردوں پر احسانات ہیں، وہیں پر عوام اور عصری طلبہ پر بھی بہت احسانات ہیں، جس طرح انہوں نے جامعہ میں رہ کر درجہ اولیٰ سے دورۂ حدیث تک کتابیں پڑھا کر طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا، اسی طرح چالیس روزہ تعلیم وتربیت کورس شروع کرکے اسکول وکالج کے طلبہ کی دینی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش فرمائی، جس طرح جامعہ میں پڑھنے والے ان کے شاگرد حضرت الاستاذ کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں، اسی طرح چالیس روزہ تعلیم وتربیت کورس بھی ان کے لئے ان شاء اللہ صدقۂ جاریہ رہے گا۔ جو انہوں نے اسکول، کالج کے طلبہ کی چھٹیوں کو ضائع ہونے سے بچانے

اور مسلمانوں کو ان کی بنیادی تعلیمات کی طرف توجہ دلانے کے لئے شروع کیا، اس کورس کی کتابوں کے لکھنے، اس کورس کے مرتب کرنے اور اپنی مسجد صالح میں اسے شروع کرنے اور کتابوں کے چھپوانے کے تمام مراحل کی خود نگرانی کی اور اخلاص کے ساتھ یہ کورس شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کورس اس قدر پھیلا کہ نہ صرف کراچی، پاکستان بلکہ بعض ممالک میں یہ کورس شروع ہوا اور ہزاروں تشنگانِ علم نے اس چشمۂ فیض سے اپنے آپ کو سیراب کیا اور بہت سارے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا۔

اللہ تعالیٰ اس کورس کو تا قیامت جاری وساری رکھیں اور استاذ محترم کے لئے صدقۂ جاریہ بنائیں اور استاذ محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں اور ہم سب پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرما کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

نتیجہ فکر: سید الابرار سعید چترالی، درجہ سادسہ

اس گلشنِ بنوری کے اک اور جانباز چلے ہیں آج
میرے محسن میرے مشفق میرے استاذ چلے ہیں آج
کبھی جو ساتھ ہوتے تھے سفر میں بھی حضر میں بھی
میرے حضرت اسکندر کے وہی ہمراز چلے ہیں آج
چمن کے گوشے گوشے میں قد دلکش کی باتیں ہیں
اہل گلشن کی نظر میں جو تھے ممتاز چلے ہیں آج
انہیں کا نام بھی ہوگا یقیناً اہل جنت میں
وہ دنیا سے شہادت کا لئے اعزاز چلے ہیں آج
جہاں تشریف رکھتے تھے وہ مسند آج خالی ہے
وہی مفتی نظام الدین وہی انداز چلے ہیں آج
جہاں کو رشک آتا ہے ایسی تھی زندگی ان کی
کیا تھا جس نے الفت کا عجب آغاز چلے ہیں آج
جب ان کی یاد آتی ہے سینے میں دل دھڑکتا ہے
سعید ہر دم اسی پر تھا جو تم کو ناز چلے ہیں آج

طیارہ حادثہ اور اہلِ علم کی رحلت

جناب عبدالقدوس محمدی

ہم ابھی اسلام آباد کے مسحور کن موسم بہار کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے تھے، رنگ برنگے پھول، سرسبزی وشادابی، خوشگوار موسم اور نظر نواز نظاروں کے ساتھ ساتھ دینی، علمی اور روحانی بہاروں نے ایک سماں باندھ رکھا تھا کہ اچانک بھوجا ایئرلائن کے طیارے کے حادثے کی خبر ملی، دل اداس ہوگیا، فوراً امداد ٹرسٹ کے امدادی قافلے کے ساتھ جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوئے۔ واہموں کا ہجوم ہوگیا، فکرمندی اور پریشانی کے سائے پھیلتے چلے گئے اور پھر موبائل فون پر برقی پیغامات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ناظم تعلیمات مولانا عطاء الرحمٰن کی شہادت کی اطلاع ملی، تھوڑی دیر بعد مولانا عبدالحکیمؒ کے پوتے اور مولانا عبدالمجید ہزاروی کے بھتیجے اور دست راست جواں سال شہزادے برادرم پیر عثمان رشید کی خبر آئی، پھر مکہ مسجد کراچی کے مولانا یوسف کشمیری کے بڑے بھائی مولانا یونس کشمیری کا سنا، اتنے میں معلوم ہوا کہ ہمارے محلے کے ایک ساتھی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور پھر اوپر تلے دل دہلا دینے والی اطلاعات۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری سے، کراچی میں جامعہ بنوریہ کے مولانا مفتی نعیم سے، اسلام آباد میں مولانا عبدالغفور، روزنامہ اسلام کے برادرم عنایت الرحمٰن شمسی اور حفیظ اللہ عثمانی سے راستے میں مسلسل رابطہ رہا، ایک دوسرے سے تعزیت کرتے، احوال معلوم کرتے رہے...... ہر کوئی سوگوار، ہر کوئی اداس...... جائے حادثہ پر پہنچے تو وہاں کا ماحول ہی سوگوار تھا...... کچھ دوست پولیس اور فوج کے آنے اور رش بڑھنے سے پہلے اصل جائے وقوعہ تک پہنچ چکے تھے، لیکن جب رش بہت بڑھ گیا اور امدادی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی تو فوج اور پولیس نے راستے بند کردیئے تھے اور عین جائے حادثہ پر جانے کی اجازت نہ تھی...... اپنے رشتے داروں کی تلاش میں دیوانہ وار پریشان اور سرگرداں لواحقین کو دیکھ

کلیجہ منہ کو آنے لگتا اور ان کی حالت دیکھ کر پریشانی دو چند ہوئے جاتی تھی...... اگر اپنا کوئی پیارا آخرت کے سفر پر روانہ بھی ہو جائے، اس کی میت سامنے پڑی ہو، یہ یقین ہو کہ ہمارا یہ عزیز اللہ کو پیارا ہو چکا تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جاتی ہے...... انسان رو دھو کر چپ ہو جاتا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ ایسی کیفیت ہو کہ اپنے پیاروں کی موت وحیات کی ہی خبر نہ ہو، میتیں ملنے اور چہرے دیکھنے کے امکان کا سورج بھی ڈوبتا دکھائی دے تو انسان کس کرب سے دوچار ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس طیارے حادثے میں جاں بحق ہونے والے لوگوں کے غم سے نڈھال لواحقین کی بے تابی، اضطراب اور بے بسی دیکھ کر ہوا...... جائے حادثہ کے قریب موجود تھے کہ استاذ مکرم مولانا شبیر احمد عثمانی تشریف لے آئے...... ایک وجیہ اور ہنس مکھ شخص کا چہرہ اس وقت اجڑا ہوا تھا، آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے تھے...... استاذ مکرم بھوجا ایئر پورٹ کی اسی پرواز کے ذریعے کراچی سے اسلام آباد تشریف لانے والے مولانا یونس کشمیری کے استقبال کے لئے ائیر پورٹ گئے ہوئے تھے، وہیں انہیں طیارے حادثے کی اطلاع ملی اور پھر وہ جائے حادثہ پر پہنچ گئے...... بکھرے لاشے، کٹے پھٹے اعضاء، طیارے کے ٹکڑے، مسافروں کا ساز وسامان مولانا شبیر جیسا کوئی باہمت دل گردے والا شخص ہی وہ منظر برداشت کرسکتا تھا...... مولانا نے ائیر پورٹ پر کچھ دیر پہلے اپنے عزیزوں کے انتظار میں جو دمکتے چہرے اور بے تاب آنکھیں دیکھی تھیں، اب جب انہیں جائے حادثہ پر روتے، پیٹتے دیکھا تو ان پر کیا گزری ہوگی؟ وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

وہ شب اسلام آباد کے باسیوں کے لئے بہت سوگوار، المناک اور پریشان کن شب تھی، جائے حادثہ اور ہسپتالوں کے درمیان بھاگتے دوڑتے، اپنی جانیں ہار جانے والوں کے ورثاء سے تعزیت کرتے اور ان کو تسلی دیتے ہوئے اور حادثے کی جزئیات وتفصیلات کرتے ہوئے بیت گئی...... اور رہ گئے وہ لوگ جنہیں اپنے پیاروں کی ''شناخت'' کے کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑا، اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہے۔ خدا خدا کر کے رات بیتی اور اگلا دن پھر جنازوں کو کندھے دیتے گزر گیا...... مولانا عطاء الرحمٰن کی نماز جنازہ مولانا مفتی ابرار کی مسجد فاروق اعظمؓ میں ادا کی جانی تھی، ایک ایسی عظیم علمی شخصیت جن کے جانے سے پیدا ہونے والا خلاء شاید کبھی پُر نہ ہو سکے، ان کی زندگی پر برادرم مولانا شفیع چترالی نے جو کچھ لکھ دیا، شاید اس پر کوئی اضافہ ممکن نہ ہو۔ مولانا عطاء الرحمٰن کا نام تو بہت سنا تھا، ان کے کام کی تفصیل بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی، لیکن انہیں بہت قریب سے لیبیا کے ایک سفر کے دوران دیکھنے کا موقع ملا۔ سفر میں ہی کسی کی شخصیت اور عظمت کھل کر سامنے آتی ہے یا پھر اس کی حقیقت اور اصلیت بے نقاب ہوتی ہے...... لیبیا کے اس سفر میں مولانا عطاء الرحمٰن کی سنجیدہ، مگر دلکش شخصیت دھیرے دھیرے دل میں اترتی چلی گئی۔ طرابلس اور

بن غازی کے وہ مناظر، وہ مجالس، وہ محافل اور مولانا کی مسکراہٹیں اور عظمتیں کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی، مسجد فاروق اعظمؓ کے باہر اتنی بڑی تعداد میں ان جواں سال علماء وفضلاء کی، جنہوں نے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے کسب فیض کیا، اُنہیں دیکھ کر مولانا عطاء الرحمٰن کی موت پر بھی رشک آنے لگا۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن عجیب دینی درسگاہ ہے، جس کا فیض بھی بہت عام اور جس کے ابناء کی قربانیوں اور دکھوں کی ایک طویل داستان ہے۔ جنازے میں یوں تو بہت سے چہرے دیکھ کر مولانا عطاء الرحمٰنؒ یاد آئے، لیکن مولانا امداداللہ صاحب اور مولانا انعام اللہ صاحب کے دکھی چہروں کو دیکھ کر مولانا عطاء الرحمٰنؒ بھی نگاہوں کے سامنے آکھڑے ہوئے، گزشتہ دنوں مولانا ولی خان المظفر صاحب نے ایک کالم میں ''امداد وعطاء'' کا جو ذومعنی عنوان باندھا تھا، ان دونوں نامور علماء کرام کی طویل باہمی رفاقت کی اس سے اچھی اور کیا تعبیر ہوسکتی ہے؟ دن کو مولانا عطاء الرحمٰنؒ کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد جب سہ پہر جواں سال مولانا عثمان رشیدؒ کی نماز جنازہ کی ادائیگی کے لئے مسلم گراؤنڈ جانا ہوا تو غم ودرد سوا ہوگیا۔ جواں سال عالم دین، ہنستا مسکراتا چہرہ، چڑھتی جوانی، مولانا عبدالمجید ہزاروی کے ساتھ بہت سی مجالس میں برادرم عثمان رشید سے ملاقات ہوئی، عمر کی صرف چھبیس بہاریں دیکھنے والا مولانا عثمان رشیدؒ ایک شہزادہ دکھائی دیتا تھا، بہت سمجھدار، بہت وجیہ، بہت سی صلاحیتوں کا مالک، اس نوجوان سے ڈھیر ساری توقعات وابستہ کرلی گئی تھیں۔ جنازے کے لئے جاتے ہوئے شیخ الہندؒ سیمینار کے اشتہارات اور پینافلیکس پر ہنستا مسکراتا عثمان رشیدؒ دیکھ دیکھ کر دل سے درد کی ایک ہوک سے اٹھتی رہی، اور جب مولانا عبدالمجید ہزاروی سے ملاقات ہوئی تو ان کی سرخ انگارہ بنی آنکھیں، ہنستا چہرہ، مغموم حالت دیکھ کر بے قرار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے:

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا تو ضرور مگر کھل کر مسکرا نہ سکا

طیارہ حادثہ پاکستان کی تاریخ کا ایک افسوسناک اور المناک حادثہ ہے، جس کا دکھ اور غم مدتوں رہے گا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ، پیر عثمان رشیدؒ، مولانا یونسؒ، مولانا عرفانؒ اور دیگر اہل علم سمیت اس جہاز کے تمام مسافروں کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا محمد عمران ولی
استاذ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

بروزِ جمعرات بتاریخ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء صبح ۹ بجے کے لگ بھگ آج سے ۱۳ سال قبل محبوبنا الفقید، شیخنا الکریم، استاذنا المکرّم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید نوراللہ مرقدہٗ نے راقم الحروف کو حضرت شہیدِ اسلام، استاذنا المکرّم فقیہ العصر شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ (۱۹۵۲ء-۲۰۰۴ء) کے مہمان خانہ میں بلاکر فرمایا کہ: ''آپ کے گاؤں میں کچھ مسئلہ درپیش ہوا ہے، غالباً آپ کے دادا جان کی طبیعت ناساز ہے (جو واقعی ناساز تھی) لہٰذا آپ یہیں (کراچی) سے وطن جائیں گے اور حضرت مفتی صاحب قندھار افغانستان سے وطن جائیں گے''۔

چونکہ حضرت والد رحمہ اللہ نے جامعہ کے ششماہی امتحانات کے اختتام پر (۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۷ اگست ۱۹۹۹ء بعد نمازِ عصر بروز منگل) قندھار افغانستان کے لئے رختِ سفر باندھا اور اگلے دن بروز بدھ بخیر وعافیت پہنچ کر حضرت مفتی شامزئی شہیدؒ کے ٹیلی فون پر اطلاع بھی دی تھی، ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہم پر کیا افتاد آنے والی ہے اور کیا عظیم قیامت ٹوٹنے والی ہے؟۔

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آپ سب گاؤں جانے کی تیاری کریں اور تقریباً ظہر پونے تین بجے کی فلائٹ ہے، چنانچہ ہم سب استاذِ محترم مولانا عطاء الرحمٰن رحمہ اللہ کی معیت میں ''بھوجا ائیرلائن'' میں غالباً ۲ بج کر ۴۰ منٹ پر کراچی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ جہاز میں جس سیٹ پر استاذنا المکرّم تشریف فرما ہوئے تو چند لمحوں بعد جہاز کے میزبانوں نے آکر استاذِ محترم سے عرض کیا کہ آپ فلاں سیٹ پر آجائیں، آپ وہاں بیٹھنے ہی لگے کہ انہوں نے فوراً کسی دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہاں تشریف رکھیں تو استاذِ محترم ذرا سا جلال میں آگئے، اپنے مخصوص اور رعب دار انداز میں ان کا

جملہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے کہ: ''تم لوگوں کو یہ بھی پتا نہیں کہ دو جمع دو چار ہوتا ہے''۔ بہر حال جہاز تقریباً ۶ بجے کے قریب اسلام آباد ائیر پورٹ پر اترا، وہاں مفتی ابرار صاحب پہلے ہی سے موجود تھے، اور انہوں نے آسانی کلر بچار واور پختہ عمر سفید ریش تجربہ کار ڈرائیور کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ استاذِ محترم کی معیت میں ساڑھے ۶ بجے اسلام آباد سے گاؤں کے لئے روانہ ہوئے اور رات تقریباً ۱۲ بجے گاؤں پہنچے، جب بٹ خیلہ شہر آبائی گاؤں کی طرف گاڑی مڑی تو بندہ نے استاذِ محترم سے پوچھا کہ: استاذ جی! ہمارے والد صاحب پہنچ گئے ہوں گے؟ اس اچانک سوال پر استاذِ محترم کچھ متحیر اور مضطرب ہوئے اور بڑی مشکل سے ان کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا کہ: ''شاید پہنچ گئے ہوں گے''۔ مگر جب گھر میں داخل ہوئے اور لوگوں کا ہمیں دیکھ کر زار و قطار رونا دیکھا تو تب پتہ چلا کہ ہمارے سروں سے وہ عظیم سائباں ہمیشہ کے لئے اُٹھ چکا ہے، اور ہمارے والد ہمیں خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ان کے نام کے ساتھ ''رحمہ اللہ'' اور انہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہو رہا ہے، کاش! وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔

ہائے اوموت! تجھے موت ہی آئی ہوتی

لیکن اللہ کی رضا کے آگے کون ٹھہرا ہے اور کون ٹھہر سکتا ہے؟ **یفعل مایشاء**۔

غالباً استاذِ محترم کا بھوجا ائیر لائن میں یہ پہلا سفر تھا اور وہ بھی غم و افسوس اور حسرتوں بھرا حادثاتی سفر، جس کی یہ بوجھل اور غمگین یادیں آج بھی دل و دماغ پر نقش کالحجر ہیں۔

جمعہ کے دن بتاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء استاذنا المکرّم حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ نے اپنی ہمشیرہ اور مخلص، محب، خادمِ خاص مولانا عرفان میمنؒ کے ساتھ ''بھوجا ائیر لائن'' ہی سے کراچی سے اسلام آباد کے لئے رختِ سفر باندھا اور استاذ جی کا یہ سفر غالباً بھوجا ائیر لائن میں دوسرا اور آخری سفر تھا اور ''بھوجا ائیر لائن'' کا یہ سفر بھی حسرتوں اور غموں بھرا ہی ثابت ہوا کہ اسلام آباد کے قریب حسین آباد کورال کے قریب بمع تمام رفقائے سفر جامِ شہادت نوش فرما گئے اور قیامت تک کے لئے ہم سے بچھڑ چکے، **إناللّٰه وإنا إليه راجعون**۔

آغا شورش کاشمیریؒ کا مشہور مقولہ ہے: ''بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اُٹھ جانے سے محفلیں سونی ہو جاتی ہیں یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخصیت ایسا خلاء پیدا کر دی جاتی ہے کہ پُر ہی نہیں ہوتا اور اگر پُر ہوتا ہے تو بڑی مشکل سے ہوتا ہے''۔

سب ہی جانتے ہیں کہ استاذنا المکرّم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ (جن کے نام گرامی کے ساتھ ''رحمہ اللہ'' لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ اُٹھتا ہے) کے اس انحطاطی اور فکری ارتداد کے مشکل ترین اور مایوس ترین دور میں اس طرح اچانک جانے سے کیا، کیسا اور کتنا عظیم خلاء پیدا

ہوا ہے، شاید مدتوں میں بھی کبھی پُر ہو سکے۔ استاذ جی ہی فرمایا کرتے تھے کہ: ''کوئی کسی کے خلاء کو پُر نہیں کرسکتا''۔ استاذنا المکرّم جیسے جامع الکمالات اور بسطۃً فی العلم والجسم کے صحیح مصداق کا یوں اُٹھ جانا موت العالِم موت العالَم کی صحیح منظرکشی کرتا ہے:

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھودیئے
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کے

ششماہی امتحانات اور سانحات

غالباً جامعہ علومِ اسلامیہ کا یہ تیسرا عجیب وغریب ششماہی امتحان ہے کہ اس کے متصل بعد عظیم سانحہ سے گلشنِ بنوری دوچار ہوا، جس طرح اس سے قبل بھی ششماہی امتحان کے بعد عظیم حادثات رونما ہوئے تھے۔

۱۹۹۹ء بمطابق ۱۴۲۰ھ کے ششماہی امتحان کے متصل ہی جامعہ کے قدیم استاذ حضرت مفتی محمد ولی درویش نور اللہ مرقدہٗ (نگران تخصص فی الدعوۃ والارشاد) نے اچانک رختِ سفر باندھا اور ہمیں اسی طرح حیران وپریشان چھوڑ کر داغِ مفارقت دے گئے تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو بتاریخ سات شوال المکرّم ۱۳۸۹ھ بمطابق ۱۹۶۹ء حضرت شیخ الحدیث مولانا نورالہدیٰ صاحب مدظلہ (مہتمم مدرسہ ربانیہ قصبہ کالونی) محدث العصر حضرت اقدس علامہ بنوری رحمہ اللہ کی خدمت میں لائے تھے اور حضرت علامہ بدیع الزمان نور اللہ مرقدہٗ متوفی ۱۹۹۹ء سے درجہ ثانیہ کے لئے جائزہ دلوا کر داخل فرمایا تھا، اس وقت حضرت درویشؒ کی عمر مبارک چھبیس سال تھی، حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کی حیات ہی میں ۱۳۹۶ء بمطابق ۱۹۷۶ء کو جامعہ ہذا سے سند فراغت حاصل کی، دوسال تخصص فی الفقہ میں گزارے اور ۱۹۷۹ء سے ہی جامعہ میں تدریسی اورانتظامی امور کی خدمات سرانجام دینی شروع فرمائیں اور یہ سلسلہ تقریباً بیس سال جاری وساری رہا، جب انتقال ہوا تو عمر مبارک چھپن برس تھی، گویا عمر کا اکثر حصہ جامعہ ہی میں گزرا۔ ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء کو یہ عظیم سلسلۂ ذھبیہ اختتام پذیر ہوا اور اس وقت جامعہ میں تعطیلات ششماہی تھیں۔

دوسرا عظیم سانحہ جو جامعہ میں امتحان ششماہی کے بعد پیش آیا، وہ فاضل نوجوان، داعی مسجد کے امام وخطیب اور جامعہ کے لائق استاذ حضرت مولانا ارشاد اللہ العباسی شہید رحمہ اللہ کی شہادت کا سانحہ تھا۔

حضرت موصوف رحمہ اللہ نے ۱۹۹۰ء میں جامعہ سے فاتحۂ فراغ پڑھا، داعی مسجد سولجر بازار میں امام وخطیب مقرر ہوئے، جامعہ میں بھی تدریسی خدمات پر مامور تھے، صبح کو نماز فجر سے قبل مسجد کے لئے نکلے کہ ذریت ابن سباء اور منافقین وفجار کے ہاتھوں شہادت جیسی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز

ہو چلے اور یوں ان کی دینی خدماتِ جلیلہ کا سنہرا باب جمعۃ المبارک ۲۵ جمادی الاولیٰ بمطابق ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ء کو بند ہو چکا۔ شہادت سے دو دن قبل بروز بدھ درجہ ثالثہ کی درسگاہ میں آپ رحمہ اللہ نے یہ دو اشعار طلبہ کرام کو سنائے:

جب انہی کو جان دینی ہے تو پرواہ نہ کر
موت تجھ پہ آپڑے یا موت پہ تو جاپڑے
فنافی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

تیسرا عظیم حادثہ اور سانحہ جو نہایت ہی افسوسناک، اندوھناک اور دہشت ناک ثابت ہوا، جس سے دل ودماغ ہل گئے، جس کی شدت سے آج تک دماغ سُن، قلب بے چین ومضطرب ہے۔ بروز جمعۃ المبارک بتاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ء بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۱۲ء بوقت سوا سات بجے بعد از نماز مغرب یہ خبر پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی کہ اسلام آباد کے قریب حسین آباد کورال کے علاقہ میں ''بھوجا ائیر لائن'' کو حادثہ پیش آیا اور اس میں سوار حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ بمع رفقائے سفر اور تمام مسافروں کے دنیا کی قید ونفس سے آزاد ہو کر رب رحیم وکریم کے ہاں حاضر ہو گئے، اس عظیم حادثہ سے ایک قیامت تھی کہ برپا ہوگئی، جامعہ کے در وبام سوگوار ہو گئے، اساتذہ کرام کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ان کے قلبی حزن وملال کی غمازی اور نشان دہی کر رہا تھا۔ طلبہ کرام اپنے محبوب ومشفق استاذ کی اس اچانک جدائی پر حیران ومبہوت تھے، خصوصاً دورۂ حدیث کے طلبہ کرام کہ کل تک انہیں مسند حدیث پر بیٹھ کر جس محبوبیت ودل لگی سے ''قال اللّٰہ وقال الرسول'' کے مبارک الفاظ اپنے مخصوص ومترنم انداز میں پڑھا رہے تھے، آج اچانک کس دور دراز سفر پر روانہ ہو گئے اور جدائی بھی ایسی کہ آخری زیارت کو بھی نگاہیں ترس گئیں۔ بقولِ شاعر:

وقت رخصت پہ طلب کی جو نشانی تو کہا
داغ کافی ہے جدائی کا اگر یاد رہے
مری بے تاب آنکھیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گلشن میں
صباء تو نے کہاں لے جاکے خاکِ آشیاں رکھ دی
تاوے نن زم سبا بہ راشم
میاشتی شوے تیرے ستاسبا کلہ رازینہ

آخری ششماہی امتحان

جامعہ اور شاخہائے جامعہ میں بروز منگل بتاریخ ۲۰ مارچ ۲۰۱۲ء ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

کوششا ہی امتحان کا آغاز ہوا، ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ آخری پرچہ تک بنفسِ نفیس موجود رہے، کیا معلوم تھا کہ استاذ جی کی امتحان ہال میں یہ آخری موجودگی ہے اور اس کے بعد قیامت تک نگاہیں انہیں یہاں نہ دیکھ پائیں گی۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ امتحان گاہ میں متعین کئے گئے حلقات میں وقتاً فوقتاً چکر لگاتے اور وہاں موجود کسی بھی کرسی پر کچھ دیر تشریف فرما ہوکر کسی دوسرے حلقے کی طرف رواں ہوجاتے (كأني أنظر إليه)

امتحان کے تیسرے دن بروز جمعرات بتاریخ ۲۸ ربیع الآخر ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۲ مارچ ۲۰۱۲ء تقریباً سوا گیارہ بجے استاذ محترم نے راقم الحروف سے فرمایا کہ یہ بیس صفحات لے لیں اور ان کی تصحیح کر کے کل مجھے واپس کردیں، پھر اچانک فرمایا کہ کل تو جمعہ ہے، بیس صفحات اور لے لو اور چالیس صفحات ہفتہ کے دن واپس کردیں۔

یہ صفحات ''باقة الازهار'' (عربی) کے تھے جو دوبارہ طباعت کے لئے تیار ہورہی تھی اور استاذ جی کے زیر نگرانی اس کی تصحیح وترتیب کا کام ہورہا تھا۔ ہفتہ کے دن بندہ نے چالیس صفحات لاکر اسی جگہ تپائیوں پر رکھ دیئے، جہاں کبار اساتذۂ کرام کی مخصوص نشست ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمانے کے بعد خوشی کا اظہار فرمایا اور دعاؤں سے نوازا، جبکہ بذریعۂ مولانا اشرف صاحب استاذِ محترم تک یہ بات پہنچائی (کیونکہ استاذ جی کے رعب وجلال کے آگے لب کشائی کی ہمت کہاں؟) کہ اس نام سے پہلے ایک چھوٹا سا کتابچہ چھپا ہے جو کہ حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کی مدح میں کہے گئے اشعار پر مشتمل ہے، یہ سننا تھا کہ استاذ محترم اسی وقت امتحان ہال سے باہر صحن کی طرف ہمارے حلقہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ: آپ اس باقة الازهار کی بات کررہے ہیں جو کہ مولانا عبدالحنان دہلوی کی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: جی استاذ جی! وہی مراد ہے، تبسم فرماکر تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اچھا کیا، تم نے بتادیا۔ صاحبِ کتاب کے سامنے یہ بات رکھ دیں گے (اور پھر اس پر بات ہو بھی گئی تھی) امتحان کے آخری دن حضرت مولانا نور الرحمٰن صاحب مدظلہ سفرِ عمرہ پر روانہ ہورہے تھے اور استاذ جی رحمہ اللہ کے ساتھ امتحان ہال میں موجود تھے، استاذ جی رحمہ اللہ نے مولانا نور الرحمٰن سے دونوں ہاتھ کھول کر معانقہ فرمایا اور سینے سے لگا کر رخصت فرمایا۔ (كأني أنظر إليهما يتكلمان ويتبسمان)

عمرہ سے واپسی پر استاذ جی نے حضرت رحمہ اللہ کو اس طرح کا سفید دھاری دار رومال پیش فرمایا تھا جو ہمیشہ سے استاذ جی رحمہ اللہ اپنے کندھے پر رکھتے، کبھی بائیں بازو پر رکھ کر چلتے، اور کبھی گول کر کے مٹھی میں لے کر چلتے، تو آخری سفر میں وہی مولانا نور الرحمٰن مدظلہ والا رومال ساتھ لیا تھا جو اس حادثہ میں دیگر اشیاء کی طرح نہ جانے کہاں رہ گیا؟ دورانِ امتحان اگر سوالیہ پرچہ کے

متعلق کچھ عرض کرنا ہوتا تو استاذ محترم ہی اپنی مخصوص صاف وشفاف آواز میں لاؤڈ اسپیکر پر طلبۂ کرام سے بیان فرماتے۔ افسوس! کہ اس پیاری آواز کے لئے کان ترس جائیں گے۔

آخری اعلان نتائج ششماہی اور اساتذۂ کرام کو مختصر نصائح:

بروز جمعرات بتاریخ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۱۹ اپریل ۲۰۱۲ء بوقت صبح ۱۰ بجے کے قریب حضرت الاستاذ نے دورۂ حدیث کی کلاس میں اساتذۂ جامعہ وشاخہائے جامعہ کے سامنے نتائج ششماہی کا اعلان فرمایا، دورانِ اعلان مختلف باتوں کی طرف مختصراً اشارے فرمائے: مثلاً جب درجہ سابعہ کے نتائج کا اعلان فرمانے لگے تو جب درجہ سابعہ ملیر اور سابعہ گلشن عمرؓ کے طلبۂ کرام کی تعداد ذکر فرمائی اور پھر جامعہ کے درجہ سابعہ کے طلبہ کی تعداد ذکر فرمائی تو فرمایا کہ: تینوں جگہ اتنی تعداد ہے تو اگلے سال دورۂ حدیث کے داخلے کے لئے بڑا المیہ ہوگا (شاید اس المیہ میں ایک دوسرے عظیم المیہ کی طرف اشارہ تھا) اسی طرح فرمایا کہ: جو اساتذۂ کرام وفاق المدارس کے امتحانات میں نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ بحسن وخوبی اس کام کو ادا کریں۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ: بعض ساتھی پرچوں کی چیکنگ کے لئے جاتے ہیں، وہ بھی بھرپور طریقے سے اس کام کو شوق ومحنت سے سرانجام دیں۔ نتائج کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب کا بیان ہوا اور اکثر حضرات نے محسوس کیا کہ استاذ جی اکثر اساتذۂ کرام سے گلے ملے، شاید کہ یہ آخری اور الوداعی پروگرام اور نشست تھی، بقول شاعر:

وصل کے دن بہت اداس تھا میں
آنے والی جدائی کا غم تھا

بقول فانی:

وصال ودید پر فانی نہ اترا
یہ عرصہ مختصر ہے سوچ لینا

اسی طرح یہ استاذ محترم کی اساتذۂ کرام کی محفل ومجلس میں آخری گفتگو اور باتیں تھیں اور پھر اس سے اگلے دن وہ جانب ملک عدم روانہ ہوگئے:

ساری عمر ان آنکھوں کو وہ سپنا یاد رہا
صدیاں بیت گئیں وہ لمحہ یاد رہا
نہ جانے کونسی ایسی بات تھی اس میں
ساری محفول بھول گئے وہ چہرا یاد رہا

یہ چند اشعار استاذِ محترم رحمہ اللہ کی نذر کرتا ہوں:

بچھڑے ہوئے لوگوں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسمِ خوشبو کی طرح روٹھنے والے!
پیغام تیرا لے کے صبا کیوں نہیں آتی
سجالیا اسے دل کے نگار خانے میں
وہ ایک زخم جو کافی ہے عمر بھر کے لئے

حضرت الاستاذ سے شرفِ تلمذ

حضرت الاستاذ سے ہمیں درجۂ رابعہ ۲۰۰۰ء میں نحو کی مایہ ناز مشہور کتاب ''شرح جامی'' پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اگرچہ قدوری حصہ اول کے بھی کچھ ابواب ان سے پڑھے، لیکن باقاعدہ کتاب جو ان سے پڑھی وہ شرح جامی تھی۔ دارالتصنیف کے سامنے والی درسگاہ درجہ رابعہ کی تھی، دس بجے وقفہ کے بعد متصل حضرت الاستاذ کا گھنٹہ شروع ہوجاتا، شرح جامی کی عبارات، دخل مقدر اور اس کے جوابات اور علماء نحو کے مسالک آپ کو فاتحہ کی طرح ازبر تھے، دورانِ سبق عربی، فارسی، اردو، پشتو کے بہترین اشعار بطورِ استشہاد پیش فرماتے۔

۲۳ شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ بمطابق جنوری ۲۰۰۰ء بروز پیر سبق کا پہلا دن تھا اور تعلیمی سال کی ابتدأ تھی، استاذ محترم تشریف لائے تو پہلے ہی دن کچھ طلبہ ذرا تاخیر سے پہنچے جو شاید وضوء وغیرہ بنانے گئے تھے، حضرت الاستاذ نے ان کو نصیحت فرمائی اور یہ شعر سنایا:

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

اسی طرح حضرت الاستاذ سے درجہ سادسہ ۲۰۰۲ء میں جلالین حصہ اول، تیسرے سپارے کا ابتدائی پاؤ پارہ پڑھنے کی سعادت ملی، چونکہ حضرت الاستاذ مولانا فضل محمد یوسف زئی مدظلہ پاؤں کے ناخن کی تکلیف کے سبب آرام فرمارہے تھے تو شیخ عطاء شہید رحمہ اللہ نے چند دن تک آکر درسِ جلالین دیا۔

اسی طرح درجہ سابعہ ۲۰۰۳ء میں باقاعدہ حضرت شیخ عطاء علیہ الرحمۃ سے علم حدیث کی مشہور زمانہ کتاب مشکوٰۃ المصابیح حصہ اول پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی، اور یہ استاذِ محترم سے آخری کتاب تھی جو ہم نے پڑھی، اللہ تعالیٰ حضرت الشیخ کے درجات بلند فرمائے، اور ان کے جانے سے جو خلاء پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ غیب کے خزانے سے پُر فرمادے، آج ان کی شہادت کو ایک مہینہ مکمل ہوا:

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

استاذ محترم کی چند حسین یادیں

مولانا اکرام اللہ خان

اکرام اللہ خان لا لا حکم .... یہ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کے وہ آخری الفاظ ہیں، جن کے بعد صرف ایک مجلس ہوئی اور استاذ محترم ہمیشہ کے لئے دنیا سے داغ مفارقت دے گئے۔

۲۶ر جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ جمعرات کے دن ششماہی امتحان کے نتائج کے سلسلے میں اجلاس کے بعد جامعہ کے مہمان خانہ میں بعض طلباء کے امور سے متعلق مشورہ طے تھا، استاذ محترم کو مشورہ کی اطلاع دینے جب میں جامعہ کے حجامت خانہ پہنچا تو آپ کرسی پر تشریف فرما تھے، سامنے لگے آئینہ میں مجھے دیکھا، آپؒ کے استفسار پر طے شدہ مشورہ کی یاددہانی کرائی تو مشورے کا سن کر فرمایا کہ: بس آتا ہوں، دیکھو! میں نے سر پر سے ٹوپی بھی نہیں اتاری ہے، صرف خط ہی بنوارہا ہوں ۔ میں مہمان خانہ پہنچا تو وہاں جامعہ کے بڑے اساتذہ کرام تشریف فرما تھے، میں محترم مفتی رفیق احمد صاحب ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا، اساتذہ کرام نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کو کہا، لیکن ہم نے اساتذہ کرام کے قدموں میں بیٹھنا اپنی سعادت تعبیر کیا۔ دومنٹ بعد استاذ محترم تشریف لائے اور صوفے پر بیٹھ کر فرمایا کہ: آپ لوگ بھی اوپر بیٹھ جائیں! مفتی صاحب کے انکار پر ہمارے نیچے بیٹھنے کی سہولت کا استاذ محترم کو اندازہ ہوگیا تو فرمایا چلو بھائی! ہم بھی نیچے بیٹھتے ہیں، اور سب حضرات نیچے بیٹھ گئے۔ ہمیشہ کی طرح آج کے اجلاس میں بھی استاذ محترم جامعہ اور طلباء کے امور میں حسب عادت ہر ہر پہلو پر رائے، اس کے لوازمات ومقدمات اور ثمرات ونتائج پر تفصیلی گفتگو سے محظوظ فرماتے رہے۔

استاذ محترم کی شخصیت بے شمار صفات کی حامل تھی۔ میں نے جامعہ میں اپنی سات سالہ عملی زندگی میں استاذ محترم کو بہت قریب سے دیکھا۔ انتہائی متواضع اور بے تکلف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری رعب اور دبدبہ بھی عطا فرمایا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ خیرخواہی کا جذبہ تھا۔ رعب اور جلال کی وجہ سے ان کی صفات کا صحیح اندازہ لگانا تو بہت مشکل تھا، پس آپ اخلاص اور وفا کے پیکر

تھے۔ جامعہ اور طلباء کی خدمت میں اخلاص کا جوہر استاذ محترم نے اپنے عمل سے سکھایا۔ استاذ محترم اپنے محبت بھرے لہجے میں فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! لوگ اخلاص کے معنی پوچھتے ہیں، اخلاص کے معنی مخلص خود سمجھتا ہے۔

استاذ محترم کو اپنے اکابر اور اساتذہ کرام پر بھرپور اعتماد تھا، ہر کام محترم استاذ حضرت ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہم سے پوچھ پوچھ کر کرتے۔ اسفار اور مقامی پروگراموں میں شرکت حضرت ڈاکٹر صاحب کی پیشگی اجازت اور رہنمائی کے بغیر نہیں فرماتے اور واپسی پر مکمل کارگزاری سے بھی حضرت کو مطلع فرماتے تھے۔ اپنے اسباق کا خلاصہ بھی کبھی کبھار حضرت ڈاکٹر صاحب کو بیان فرماتے تھے۔ زیر مطالعہ مختلف علمی نکات پر اساتذہ بلکہ ہم جیسے طلباء سے بھی گفتگو فرماتے تھے۔

استاذ محترم کو عرق النساء کی تکلیف تھی، اس کے باوجود اپنے اساتذہ کرام اور اکابر کے سامنے باادب تلمیذ کی طرح بیٹھتے۔ آپؒ شستہ زبان کے حامل تھے، کبھی استاذ محترم کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں سنے جو شستگی زبان کے منافی ہوں، چھوٹوں کا نام بھی ادب سے لیتے تھے، کسی کا نام بغیر ''صاحب'' کے نہیں لیتے تھے۔ جامعہ کے سابق ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب رحمہ اللہ جو استاذ محترم کے استاذ بھی تھے، ان کی علالت کے باعث جامعہ کی مجلس شوریٰ نے استاذ محترم کو ناظم تعلیمات کے عہدے پر مقرر کیا تو حضرت رحمہ اللہ کی زندگی میں کبھی بھی ناظم تعلیمات کی نشست پر نہیں بیٹھے، ان کی رحلت کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کے حکم اور اصرار پر صرف چند بار ہی اس نشست پر بیٹھے، ہمیں یہ اندازہ ہوتا تھا کہ استاذ محترم پر یہ کتنا گراں گزر رہا ہے۔ بغیر نام اور عہدہ کے کام کرنا ان کا شعار تھا، تشہیر سے سخت نفرت تھی۔

استاذ محترم کے تذکرہ کے یہ الفاظ لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ ان کی زندگی میں کیا مجال تھی کہ کوئی ان کا اس طرح تذکرہ کرے؟ جامعہ کے مالی معاملات میں انتہائی محتاط رہتے تھے اور محتاط رہنے کا درس دیتے۔ حضرت مہتمم صاحب اور نائب مہتمم صاحب کے اسفار کے موقعہ پر مالی معاملات سے متعلق اگر استاذ محترم کے ذمہ دستخط کی ذمہ داری ہوتی تو متعلقہ نگران سے فرماتے تھے کہ رقم کی تفصیل آپ اپنے ہاتھ سے لکھ دیں، دستخط میں کردوں گا۔ اپنی تنخواہ میں سے لاعلی التعیین کچھ رقم دفتر محاسب میں اس لئے جمع کرواتے تاکہ جامعہ کے املاک کے استعمال میں بے احتیاطی کا ازالہ ہو سکے۔

حضرت استاذ محترمؒ انتہائی زیرک اور معاملہ فہم تھے، بعض معاملات میں استاذ محترم کی رائے بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقیقت سمجھ میں آنے پر معلوم ہوتا کہ واقعۃً استاذ محترم کی رائے درست تھی۔ جامعہ کے بڑے ذمہ دار اور بیشتر اساتذہ کے استاذ ہونے کے باوجود اصلاح کا طریقہ حکیمانہ تھا، سامنے والے کی عزت نفس کا خاص خیال رکھتے

تھے، یہی وجہ تھی کہ اساتذہ کے دلوں میں استاذ محترم کی خاص عظمت تھی۔ انتظامی معاملات میں مصروفیات کے باوجود سبق کا ناغہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ ادارے کے لئے اور ہمارے لئے مشکل وقت میں بڑا سہارا تھے، والد یا بڑے بھائی کی طرح ہماری رہنمائی فرماتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، اسی لئے اسکول اور کالج کے طلبہ کے لئے جامع مسجد صالح جہانگیر پارک صدر کراچی میں چالیس روزہ دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کورس متعارف کروایا، یہ کورس اتنا مفید اور مقبول عام ثابت ہوا کہ اس کی افادیت کی وجہ سے ملک کے کئی مقامات کے علاوہ بیرون ملک بعض فضلاء جامعہ اپنے اپنے حلقوں میں اس کورس کا اہتمام کررہے ہیں۔ طلباء اور متعلقین کی اصلاح کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے، استاذ محترم کے قریب رہنے والے زیادہ باادب ہوتے تھے، کیونکہ استاذ محترم مصاحبین کی کوتاہیوں پر فوراً اصلاح فرماتے تھے۔ کوئی مصافحہ کرتے وقت خاموش ہوتا تو فوراً فرماتے کہ مصافحہ سے قبل زبان سے سلام کرنا سنت ہے، مصافحہ بغیر سلام کے لاحاصل ہے۔ کوئی مصافحہ کرتے وقت دو انگلیاں ملاتا تو ناصحانہ تنبیہ فرماتے کہ بھائی! اگر پورا ہاتھ نہیں ملانا چاہتے ہو تو مصافحہ کیوں کرتے ہو؟ اپنی اصلاح کرو۔ کوئی گیلے ہاتھوں سے مصافحہ کرتا تو فرماتے: ہاں! اپنے ہاتھ دوسروں پر صاف کرتے ہو؟

طلباء بعض اوقات راستوں میں چھٹی وغیرہ کی درخواستیں پیش کرتے تو فوراً تنبیہ فرماتے اور فرماتے کہ مولوی صاحب! ادب سیکھو، موقع محل پہچانو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ اس طرح کی بے شمار رہنمائیاں ہیں جو ایک مہذب انسان بننے کے لئے بہت ضروری ہیں۔ طلبہ کی غیر حاضری پر بہت ناراض ہوتے تھے، تین دن سے زیادہ رخصت کی درخواست پیش کرنے والے طلباء استاذ محترم کے جلال کی وجہ سے دفتر سے واپس چلے جاتے تھے تو استاذ محترم ہم سے فرماتے تھے کہ اگر اس مولوی صاحب کا چھٹی پر جانا ناگزیر ہو تو پرچی بنا کر دیدو اور یہ تاکید کردو کہ جلدی واپس آنے کی کوشش کرے، ورنہ رخصت کالعدم ہوسکتی ہے۔

ایک مرتبہ حرمین کے سفر سے واپسی پر مجھ سے فرمایا: آپ حرم میں یاد آئے تو میں نے آپ کے لئے دعا کی، دیکھو بھائی! یہ جامعہ کی برکات ہیں۔ اللہ تعالی استاذ محترم کی ان دعاؤں کو ہمارے حق میں قبول فرمائے، ان کی بال بال مغفرت فرماکر ان کے درجات بلند فرمائے، آپؒ کی مساعی جمیلہ کو آپؒ کے لئے راحت کا سامان بنائے، استاذ محترم کے جملہ لواحقین، بالخصوص ان کے والدین ماجدین، اہل خانہ، ان کے یار غار حضرت استاذ محترم مولانا امداد اللہ صاحب مدظلہ اور ان کی نسبی وروحانی اولاد کو صبر جمیل عطا فرمائے، جامعہ کی ترقی کو بغیر کسی آزمائش کے برقرار رکھے۔ آمین

محمد عیاض عابد

دردِ دل کی داستاں

کیا کہوں کس کو سناؤں دردِ دل کی داستاں
میرے محسن دے گئے ہیں داغِ فرقت ناگہاں

جب سنی اہلِ تعلق نے شہادت کی خبر
ہوگئے آنکھوں سے سب کے اشکہائے خوں رواں

یاد کرتا ہے تجھے تو آج بھی دارالحدیث
وہ عبارت کی صدائیں پھر سے گونجیں گی کہاں

جامعہ بھی تیرے غم میں ہے سراپا مضطرب
مادرِ علمی کا تھا ہر وقت گویا پاسباں

صاحبِ عالی بصیرت علم و عرفاں کا بحر
طالبانِ علم پر بے حد شفیق ومہرباں

زندگی علم وعمل کی تھی حسیں اِک امتزاج
ہوگیا اللہ کے دربار میں ہے کامراں

آپ کو فنِ خطابت میں بھی حاصل تھا کمال
عربی واردو ادب میں ایک بحرِ بے کراں

شخصیت تھی بسطۃً فی العلم والجسم آپ کی
آپ کی رحلت پہ روئے ہیں زمین وآسماں

تیری قربانی یقیناً رنگ لائے گی کبھی
کیا یہ ممکن ہے کہ ہو خونِ شہیداں رائگاں

ان شاء اللہ! صبر کا دامن نہیں چھوڑیں گے ہم
اہل حق دکھ درد میں کرتے نہیں آہ وفغاں

کون گِن سکتا ہے تیری خصلتیں اشعار میں
بس سرِ تسلیم خم کرتی ہے عابد کی زباں

علم وعمل کا بحرِ بے کراں

محمد اسد اللہ غالب بلتستانی
متعلم شاخ جامعہ بنوری ٹاؤنؒ کراچی

گزشتہ دنوں بھوجا ائیر لائن کے دل خراش فضائی حادثہ میں جہاں دیگر لوگوں کو اپنے پیاروں کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا، وہیں ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی کو ایک عظیم مربی، مدرس، استاد الحدیث اور انتظامی معاملات میں بے مثال ایک قیمتی گوہر سے محروم ہونا پڑا۔ یہ گوہر ''عطاء الرحمٰن'' کے نام سے اسم بامسمیٰ تھا۔ ہاں یقیناً! وہ اس عظیم جامعہ کے لئے رب کی عطا تھے، اور وہ اس جامعہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت شہیدؒ نے اپنے دس سالہ نظامت تعلیم کے دوران جامعہ اور اس کی شاخوں کے تعلیمی معیار کو انتہائی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ حضرت شہیدؒ سے جامعہ کے اساتذہ وطلبہ کو انتہائی عقیدت ومحبت تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کی شہادت کی خبر سن کر کتنے ہی اساتذہ وطلبہ دھاڑیں مار کر روتے رہے اور جامعہ کے دارالحدیث میں موجود غم زدہ اساتذہ کی حالت دیکھ کر سخت دل انسان کا دل بھی پسیج ہو کر رہ جاتا اور آنکھ اشکبار اور دل مغموم ہو جاتا، تادم تحریر بھی کتنی ہی آنکھیں حضرت شہیدؒ کی یاد میں پرنم ہیں۔ بقول کسے:

ہر آنکھ اشک بار ہے، ہر دل سوگوار ہے
میرا شیخ عطاء کہاں ہے؟ میرا شیخ عطاء کہاں ہے؟

حضرت شہیدؒ نے ۱۹۶۰ء میں مردان کے ایک گاؤں بابوزئی میں اسکول کے ہیڈ پرنسپل مشفق الرحمٰن کے گھر آنکھ کھولی، اگرچہ آپؒ کے والد محترم خود تو عالم دین نہ تھے، لیکن آپؒ کے دادا ہندوستان کے پڑھے ہوئے ایک جید عالم دین تھے، اسی وجہ سے گاؤں میں آپؒ کا گھرانہ مذہبی مشہور، اور ''مولوی صاحب کا خاندان'' سے یاد کیا جاتا ہے۔ سن شعور کو پہنچتے ہی شفیق والد نے اسکول میں داخل کروایا اور اپنے ہی زیر سایہ میٹرک تک عصری علوم کی تعلیم دی، اس کے بعد مذہبی ذہنیت کے حامل والد محترم نے آپؒ کو دینی علوم کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے دینی علوم کی ابتدائی کتب خیبر پختونخواہ (سرحد) میں پڑھیں، اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے

لئے ''مدارس کا شہر کراچی'' کی طرف رختِ سفر باندھا اور جامعہ بنوری ٹاؤن میں درجہ ثالثہ میں داخلہ لیا اور اسی جامعہ سے سندِ فراغت اور تخصص فی الفقہ کرنے کے بعد یہیں سے ہی اپنے استاذوں کے زیرِ سایہ تدریس کا آغاز کیا۔ اور پھر تادمِ شہادت اسی جامعہ سے وفاداری نبھاتے رہے، اور پھر اچانک اس پھلتے پھولتے گلشن کو اپنی جدائی کا بوجھل صدمہ دے کر کوچۂ آخرت کو روانہ ہوگئے۔

کلیوں کو میں خونِ جگر دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضاء یاد کرے گی

حضرت شہیدؒ بچپن سے ہی انتہائی ذہین وفطین، محنتی، شریف الطبع اور خوش طبیعت تھے۔ جامعہ بنوریؒ ٹاؤن کے استاذ، جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا رزین شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: ''میں نے اور حضرت شہیدؒ نے جامعہ میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا، آپؒ اسباق میں انتہائی محنت فرماتے اور اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کرتے تھے، اور اللہ نے آپؒ کو حسنِ صوت کے ساتھ عبارت خوانی کا بھی خاص انداز عطا فرمایا تھا، دورہ حدیث کے سال استاذ العلماء مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹونکیؒ خصوصی طور پر حضرت شہیدؒ کو عبارت پڑھنے کا فرماتے تھے''۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے آپؒ کی تدریس میں نکھار عطا فرمایا تھا۔ جامعہ کے طلبہ جانتے ہیں کہ حضرت شہیدؒ کے درس میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ آپ برموقع عربی، اردو اور پشتو اشعار، محاورات اور علمی وادبی چٹکلوں کا استعمال فرماتے تھے اور ساتھ ساتھ فرقِ باطلہ کا بھی انتہائی مدلل انداز میں رد فرماتے تھے۔ آپؒ کی تدریس میں مہارت اہلِ علم کے ہاں مسلم تھی، اسی وجہ سے آپؒ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصابی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اور آپؒ اصول وضوابط کے انتہائی پابند تھے، اصول کی خلاف ورزی پر اگرچہ وہ آپؒ کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، نرمی کا معاملہ نہ برتتے تھے۔ حضرت شہیدؒ کے جہاں اندرونِ ملک ہزاروں شاگرد ہیں، وہیں بیرونِ ممالک میں بھی آپؒ کے ہزاروں شاگرد ہیں، جن کی دعوت پر آپؒ نے کئی ممالک کا دورہ فرماکر وہاں کے دینی پروگرامات میں شرکت اور کئی مدارس ومساجد کا افتتاح فرمایا تھا۔ حضرت شہیدؒ کے مزاج میں تصنع، تکلف اور ریا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اتنے بڑے جامعہ کے ناظمِ تعلیمات ہونے کے باوجود کار، موٹر سائیکل وغیرہ کسی سواری کے بھی مالک نہ ہوئے اور ساری زندگی درویشانہ انداز میں گزاردی۔ حضرت شہیدؒ کے ایک قریبی عزیز نے بتایا کہ'' گاؤں کے عام لوگوں کو حضرتؒ کے اتنے بڑے مقام کا علم نہ تھا، اگرچہ آپؒ سال میں ایک، دوبار گاؤں بھی تشریف لاتے تھے، مگر عام پبلک ٹرانسپورٹ یا کسی جاننے والے دوست کی گاڑی میں تشریف لاتے، لیکن آپؒ کے جنازے میں اتنی بڑی خلقت اور جید علمائے کرام کی شرکت کو دیکھا تو سر پکڑ کر رہ گئے کہ یہ تو بہت

بڑے عالم تھے!!۔'' ایک اور واقعہ بھی جس سے حضرت شہیدؒ کے درویش صفت مزاج کا پتہ چلتا ہے، جو جامعہ کے استاذ الحدیث، شیخ التفسیر مولانا قاری مفتاح اللہ صاحب نے سنایا: ''ایک سال جب میں حج پر گیا، جب کہ میں حضرت مفتی زرولی خان صاحب مہتمم جامعہ احسن العلوم کراچی کے گروپ میں شامل تھا، اور ہماری رہائش وغیرہ کا بھی انتظام پہلے ہی سے ہو چکا تھا، اچانک مولانا شہیدؒ سے ملاقات ہوگئی۔ جب میں نے ان سے رہائش کے متعلق پوچھا تو جواب ندارد، پھر میں نے حضرت شہیدؒ کو اپنی قیام گاہ میں ٹھہرنے کی دعوت دی، جسے آپؒ نے قبول فرمایا اور چار، پانچ دن ہمارے ساتھ گزارے''۔ سبحان اللہ! کیا عجیب درویشانہ مزاج تھا!!۔

حضرت شہیدؒ جامعہ بنوریؒ ٹاؤن سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ، جامع مسجد صالح صدر میں امامت وخطابت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ آپؒ نے ۲۰ اپریل کو اسی مسجد میں اپنی زندگی کا آخری خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا، پورے خطبہ میں آپؒ نے عوام الناس اور نوجوان نسل کو موت کی تیاری اور توبہ کی تلقین کی، اسی خطبہ کا اقتباس ملاحظہ ہو: ''نوجوانو! توبہ کرو، موت کا کوئی پتہ نہیں، دنیا میں آنے کی ترتیب ہے کہ پہلے باپ آتا ہے پھر بیٹا، لیکن جانے کی کوئی ترتیب نہیں''۔ پھر آپؒ اسی دن ۵ بجے بھوجا ائیرلائن میں اپنی نیک سیرت ہمشیرہ کے ساتھ اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے، کسے معلوم تھا کہ آج علم وعمل کا بحر بیکراں، سراپا عجز وتقویٰ درحقیقت آخرت کا راہی ہو رہا ہے۔

وہ سرتاج دیوبند، منبع علم وعرفاں چھپ گیا
حکمتوں کا بحر بیکراں، آج پھر سے غزالیِٔ زماں چھپ گیا
تاریخ نے خود کو دھرایا دوبارہ
ثانیِٔ احمد الرحماں چھپ گیا

حضرت شہیدؒ کی نماز جنازہ کی امامت اسلام آباد میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور آپؒ کے آبائی گاؤں میں جہاں آپؒ کا ابھی مدفن بھی ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے کی، دونوں جنازوں میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کر کے حضرتؒ سے عقیدت کا ثبوت دیا۔ حضرت شہیدؒ کی شہادت کے بعد استاذ العلماء حضرت مولانا انور بدخشانی صاحب نے دورہ حدیث کے طلبہ کے سامنے حضرت شہیدؒ سے وابستہ یادوں کے دریچے وا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

ما ہرچہ خوانده ایم فراموش کرده ایم
الا حدیث عطاء کہ تکرار میکنیم

اللہ رب العزت اس فضائی حادثہ میں شہید ہونے والے سب مسلمانوں کی مغفرت اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، اور سب کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

نتیجہ فکر: مولانا رضوان احمد جاذب

ڈھونڈتی ہے شامِ غم اُس علم کے مہتاب کو
یاد کرتا ہے چمن اس غنچۂ سیراب کو

رونقِ محفل بھی اور جانِ اہلِ دل بھی تھا
اِس لئے آتا رہے گا یاد سب احباب کو

اب تلک کانوں میں جس کے زمزموں کی گونج ہے
ڈھونڈتی ہے ہر نظر اُس بُلبلِ شاداب کو

شخصیت میں رعب تھا اور دل میں شفقت کا دُھنی
اپنے بچوں کی طرح پیار تھا سب طلّاب کو

کل تلک روشن تھیں آنکھیں جس کی جھلمل سے تمام
کیسے کہہ دیں کھوچکے ہم اُس گوہرِ نایاب کو

فکر عالی تھی تری اور ذہن تعمیری تھا
تیری فرقت کر گئی حیراں اولوالالباب کو

تو سراپا یادگارِ بزرگانِ دین تھا
خوں رُلاتی ہے کمی تیری ترے اصحاب کو

نظر بنوری نے صحبت نے حبیب اللہ کی
تجھ کو پَرکھا اور نکھارا ترے آداب کو

تو رفیقِ احمدالرحمٰن تھا اُن سے جاملا
یوں مقدر نے بنایا بحر جوئے آب کو

تھا مُشاورِ عبدالرزاق وسفر میں ہمرکاب
کون روکے ان کی آنکھوں سے رواں خوناب کو

جامعہ بنوری ٹاؤن تجھ پہ نازاں کیوں نہ ہو

تو نے تعبیری نشاں بخشا ہے اس کے خواب کو
مثل اپنے نام کے تو تھا عطاء رحمٰن کی
تجھ پہ سجنے کے لئے ہے بے کلی القاب کو

انجمن سے دفعۃً اوجھل ہوا کچھ اس طرح
انتظار اب بھی تیرا علم کے ارباب کو

سایۂ رحم خدا ہو خُلد میں تیرا مکاں
اُڑ کے پائے تو عطاء اُس منزلِ بے تاب کو

دعویِ جاذب ہے بھولیں گے نہ شیدائی ترے
قابلِ تقلید تیری زندگی کے باب کو

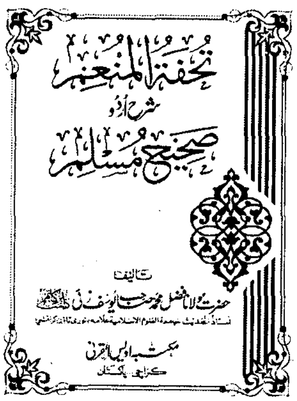

خوشخبری
انتظار کی گھڑیاں ختم!!!
صحیح مسلم کی پہلی اردو شرح کی پہلی دو جلدیں منظرِ عام پر!
معیاری پرنٹنگ
ریگزین ٹائٹل
اعلی کاغذ

ملنے کے پتے:
مکتبہ امام محمدؒ بنوریؒ ٹاؤن کراچی
مکتبہ لدھیانوی بنوریؒ ٹاؤن کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی
ادارۃ الانور بنوریؒ ٹاؤن کراچی
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
اس کے علاوہ ملک کے دیگر بڑے کتب خانوں سے طلب فرمائیں
http://www.moa.com.co Mobile:03332411115

آہ! مشفق استاذؒ

مولانا محمد طیب لدھیانوی
مکتبہ جامعہ بنوری ٹاؤن

کراچی سے اڑنے والا طیارہ تیز وتند آندھی، کڑکتی آسمانی بجلی اور موسلا دھار طوفانی بارش میں اپنے مسافروں کو اس جہاں میں لے گیا جہاں سے کوئی بھی واپس پلٹ کر نہیں آتا، اس افسوس ناک حادثہ کا شکار ہونے والوں میں ملک کی عظیم دینی درسگاہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے وفادار، قابل فخر استاذ اور ناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ بھی شامل ہیں۔

کلیوں کو میں خونِ جگر دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

آہ!...... استاذ محترم کی دینی وعلمی خدمات، آپ کا اخلاص وللّٰہیت، آپکی دیانت، امانت، ذہانت وفطانت، تصنع وتکلف اور شہرت ونمود سے آپ کی طبعی نفرت وکراہت کا آنکھوں دیکھا حال، ایسی جامع کمالات وصفات ہستی کا یکا یک نظروں سے اوجھل ہوکر تعلیم وتدریس کی محفل کے علاوہ ہزاروں شاگردوں، فضلائے جامعہ، اساتذۂ کرام، رشتہ داروں کے دلوں کو ویران کر جانا جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔

آپؒ ایک بارعب اور باکمال شخصیت کے مالک تھے، ہمیں درجہ اعدادیہ میں پڑھایا، اس وقت حساب/ ریاضی پڑھاتے تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے: گھنٹہ حساب کا ہے، مگر حساب کتاب، اچار چٹنی، کھٹا میٹھا سب ہوگا، واقعی آپؒ گھنٹہ میں دین کی بہت اہم باتیں، حدیثوں کا خلاصہ، دیگر اہم اہم واقعات بیان فرماتے تھے، ابتداء ہی سے خوب باصلاحیت اور باکمال بنانے کی سعی فرماتے رہتے تھے۔ نحومیر، ہدایۃ النحو، زاد الطالبین، حسامی، تفسیر القرآن، ریاض الصالحین، شرح جامی، جلالین، مشکوٰۃ اور صحیح مسلم وغیرہ کتب اپنے ایک مخصوص انداز سے پڑھاتے تھے۔

استاذ محترم شہیدؒ اپنی گرج دار، خوبصورت اور مترنم آواز کے ساتھ جب بنوری ٹاؤن کی بابرکت فضاؤں میں ''قـــال رســول اللہ ﷺ'' کی صدا بلند کرتے تو ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا...... کہ شاید وہاں موجود ہر ہر چیز اپنے اپنے انداز سے آپؒ کے درس میں شرکت کی سعادت اور آپؒ کے دل کش اندازِ تدریس سے روحانی سکون پارہی ہے، آپؒ نے جامعہ سے نہ صرف فیض حاصل کیا، بلکہ جامعہ سے وفاداری، خدمت اور اس کا حق ادا فرماتے رہے۔

مجھے یاد ہے حضرت مفتی احمد الرحمنؒ کے زمانہ میں ۹/۱۰ محرم الحرام کو اہلِ تشیع کے جلوس کے موقع پر جبکہ ہر طرف ناکہ بندی، فائرنگ، پولیس والوں کی طرف سے شدید شیلنگ جامعہ کے اطراف میں ہورہی تھی، بڑے بڑے افسران، ڈی آئی جی، ڈی ایس پی، رینجرز، پولیس کا چاروں طرف پہرا تھا، اس موقع پر حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کے ہمراہ دیگر علماء کے ساتھ جلوس کو روکنے کے لئے اپنے سینہ میں گولی کھانے کے لئے یا جیل جانے کے لئے جو حضرات قدم بڑھاتے ہیں، ان میں ایک ہمارے استاذؒ بھی تھے۔ ان ناعاقبت اندیش افسران کے حکم پر مفتی صاحبؒ کے ساتھ استاذ شہیدؒ کے علاوہ دیگر علماء کرام کو کئی روز تک جیل کی سلاخوں میں بند رکھا۔

آپؒ گوناگوں صفات کے مالک تھے، بہترین اعلیٰ منتظم، قابل مدرس اور ایک اچھے عمدہ خطیب تھے؛ عرصۂ دراز سے صالح مسجد صدر کراچی کے امام خطیب رہے۔ وہ ہر فن کے ماہر تھے، سادہ زندگی کے حامل تھے، شفیق ومہربان تھے اور دوستانہ تعلق رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اچانک حادثہ کی خبر سن کر کئی ہمارے ساتھی، آپؒ کے قریبی شاگرد غم کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہوگئے، آپؒ تقریباً ۲۷ سال سے متواتر جامعہ میں تدریس فرمارہے تھے، گذشتہ دس سال سے ناظم تعلیمات تھے، آپؒ سے قبل استاذ محترم مولانا عبد القیوم چترالیؒ تھے، جن کے مستقل صاحب فراش ہوجانے کے بعد آپؒ کو ناظم تعلیمات بنادیا گیا۔

استاذؒ سے دوستی، تعلق نبھانے والے شاگرد اور فضلاء ایسے کہ ایک بار کسی سے تعلق پیدا ہوجاتا تو تمام تکلفات، فرق مراتب، شاگردی اور استاذی کے رشتے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تعلق نبھاتے، وہ دوستی میں تکلف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ہمارے گہرے ساتھی مولانا محمد عرفان حمید میمن شہیدؒ جو اس سفر میں بھی مولاناؒ کے فریق تھے، اس کی واضح مثال ہیں کہ وہ مولانا کے شاگرد تھے، لیکن جس نے بھی دونوں کو ساتھ دیکھا، یہی تبصرہ کیا کہ کیا بے تکلف دوستی ہے؟! الحمد للہ! حضرت بنوریؒ کے اخلاص کی بدولت جامعہ علوم اسلامیہ کی مٹی انتہائی زرخیز ہے، اس سے اخلاص، سچے دل سے وفا کرنے والوں سے اللہ پاک نے ضرور دین کا کام لیا، کام بھی ایسا کہ جس کی معاشرے کو سخت ضرورت ہو۔ آپؒ اس فکر میں رہتے کہ

اسکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ، طالبات سالانہ چھٹیوں کو ضائع نہ کردیں، عصری اداروں میں زیر تعلیم لڑکوں/لڑکیوں کے لئے سالانہ چھٹیوں میں ابتدائی دینی تربیت کے چالیس روزہ تربیتی پروگرام کی بنیاد اسی صالح مسجد صدر میں رکھی، اور اس کے لئے متفرق کتابیں ترتیب دیں، یہ سلسلہ بہت جلد مقبول ہوا، کراچی کی طرح ملک بھر میں علماء اور جامعہ کے فضلاء اسی انداز سے تعلیم وتربیت کے پروگرام ترتیب دے رہے ہیں، بلا شبہ اس کار خیر کا سہرا استاذؒ کے سر ہے، یہ صدقۂ جاریہ ان شاء اللہ! درجات کی بلندی کا باعث بنے گا۔ آپؒ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نصابی کمیٹی کے ممبر بھی تھے، آپؒ اصول ضوابط کے انتہائی پابند تھے، اصول کی خلاف ورزی پر اگرچہ آپؒ کا قریبی عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، نرمی کا معاملہ ہرگز نہ فرماتے تھے۔

حضرت شہیدؒ کے جہاں اندرونِ ملک ہزاروں شاگرد ہیں، وہیں بیرون ممالک میں بھی آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں، جن کی دعوت پر کئی ممالک کا دورہ فرما کر وہاں کے دینی پروگرام میں شرکت اور کئی مدارس ومساجد کا افتتاح فرمایا تھا، آپؒ نے بے انتہاء امانت داری اور دیانت داری کا ثبوت دیا، بارہا جامعہ کے کتب خانہ سے کوئی کتاب یا شرح مطالعہ کے لئے لیتے، فراغت کے فوراً بعد از خود آکر اپنے نام سے کٹواتے، اکثر پوچھتے رہتے کہ میرے نام کوئی کتاب یا شرح تو نہیں؟ حادثہ سے ایک روز قبل معمول کے خلاف مغرب کی نماز کے بعد کتب خانہ تشریف لائے، علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے: میرے نام کتاب/شرح ہو تو کل بتادینا، کیا معلوم تھا کہ زندگی کی آخری باتیں اور ملاقات ہے؟ آپؒ کی ہمشیرہ صاحبہ اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے شوہر کے کسی عزیز کی وفات پر کراچی آئیں، ان کا یہ پہلا کراچی کا سفر تھا، واپسی بذریعہ بس سفر کا ارادہ کرچکی تھیں، مگر بھائی جان شہیدؒ نے روک لیا کہ میرے ساتھ جہاز سے سفر کرنا، مگر کسے معلوم تھا کہ بھائی جان صرف چند گھنٹوں کی رفاقت پر راضی نہیں ہوں گے، یہ جہاز کا ٹکٹ کسی لمبے سفر کا ہے، نیز بہن نے بھی بھائی کا ساتھ نبھا کر ثابت کردیا کہ خون کے رشتوں میں کتنی وفا ہے؟

دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس فضائی حادثہ میں شہید ہونے والے تمام مسلمانوں خصوصاً استاذ شہیدؒ اور دیگر علمائے کرام کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ سب کے لواحقین، عزیز واقارب، رشتہ داروں کو صبر جمیل عطا فرمائے، مولانا عطاء الرحمٰنؒ کی اہلیہ، صاحبزادوں، خصوصاً آپؒ کے والدین کو حوصلہ نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆....☆☆

حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ

ایک شخص... ایک انجمن

محمد یاسر عبداللہ، متعلم تخصصِ فقہِ اسلامی

ہمارے شیخ رحمہ اللہ کی شخصیت اس قدر پرکشش تھی کہ جو ایک بار ملتا آپ کے اخلاق وعادات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا، ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ ان کا سب سے زیادہ مجھ سے تعلق ہے اور یوں اس سنت پر ان کا غیر اختیاری عمل تھا۔ برادرم مولانا فصیح الرحمٰن کے بقول: شہادت کے بعد جامعہ میں صفائی پر مأمور ایک غیر مسلم تعزیت کے لئے آیا، اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ: مجھ سے وہ تعلق رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً چپکے سے مالی تعاون کیا کرتے تھے۔

جامعہ کے ایک ادنیٰ خادم کے ساتھ جب آپ کا یہ معاملہ تھا تو اساتذہ وطلبہ کے ساتھ تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بندہ نے خود عوام الناس میں سے کئی لوگوں کو یہ اظہار کرتے سنا کہ: مولانا ہمارا بڑا خیال رکھتے تھے، کبھی کبھار فون کرکے حال احوال دریافت کرتے، پریشانی اور مسائل سنتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے، ہماری خوشی غمی میں شریک ہوتے اور ہمیں اپنائیت کا احساس دلاتے تھے۔ طرزِ زندگی میں وضع داری اور احباب ومتعلقین کے لئے طرح داری حضرت استاذ جی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اپنی بے انتہا مصروفیت اور بے شمار مشاغل کے باوجود تعلق داری کا یہ وصف یقیناً ان کی کھلی کرامت تھی۔ میرے محسن ومربی حضرت شیخ عطاء رحمہ اللہ کا ایک نمایاں وصف ''اکابر پر اعتماد'' تھا، آج کا زمانہ فتنوں کا زمانہ ہے، جس میں علمی اور فکری تحریکوں کا ایک طوفان برپا ہے، قلم وقرطاس کے عموم وشیوع کے متعلق لسانِ نبوت کی بیان کردہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوتے دکھائی دے رہی ہے۔ منفرد اسلوب اور پُرفریب طرزِ تحریر کے ساتھ ''تحقیق کے نام پر تشکیک'' کا زہر گھول کر پلانے والے دانشوروں کی ایک کھیپ اُمنڈتی چلی آرہی ہے، جو پچھلوں کی تحقیقات پر خطِ نسخ پھیر کر اپنی آراء کو نصوص کا درجہ دینے پر مصر ہیں اور آزادیٔ اظہارِ رائے کے دلرُبا نعرے کے ذریعہ مسلمات ومجمع علیہا مسائل کو بھی از سرِ نو غور وفکر اور ''اجتہاد'' کے لائق قرار دے رہے ہیں۔ حضرت استاذِ محترم نہایت ذکی الحس اور بالغ النظر عالم تھے، گرد وپیش کے احوال، اٹھتی ہوئی تحریکوں اور نت نئی تحقیقات پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے وہ خود بھی اپنے آپ کو اکابر کے دامن کے ساتھ باندھے ہوئے تھے اور طلبہ کو بھی اسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اپنے درس وبیانات میں اکثر اکابر کے اقوال سناتے اوران

کی عظمت دلوں میں بٹھاتے ۔ ایک بار فرمانے لگے کہ: ''میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ انہی اساتذہ سے پڑھ کر جاتے ہیں اور پھر اُنہی کو بُرا بھلا کہتے ہیں''۔ اکابر کے مسلک ومنہج اور ان کی علمی تحقیقات پر استاذ جی کو کلی اعتماد تھا، اس سلسلے میں وہ ''متعصب'' تو نہیں تھے، لیکن ''متصلّب'' ضرور تھے۔

ہمارے شیخ رحمہ اللہ (جن کو طلبۂ بابوزئی مردان اور اہل خانہ محبت سے ''لالہ جی'' کہا کرتے تھے) میں عشقِ رسالت کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا، دورہ حدیث کے سال صحیح مسلم (جلدِ ثانی) کے درس اور دیگر مواقع میں ذکرِ رسالت (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) پر ان کی ضبط کرتی آنکھیں اس وقت بھی نگاہوں میں گھوم رہی ہیں، اگر چہ اپنی قلبی کیفیات کے اخفاً کی حد درجہ کوشش فرماتے تھے، لیکن عشق کی خوشبو بھی بھلا چھوٹے بغیر رہتی ہے؟ دلی کیفیت سے قریب بیٹھنے والا ضرور متأثر ہوتا ہے، اپنے لطیف انداز میں رومال سے آنسوؤں کو تو وہ پونچھ لیتے تھے، لیکن متأثر ہوتے قلوب کو روکنا ان کے اختیار میں نہ تھا، چنانچہ بارگاہِ رسالت سے اس تعلق کا اظہار وقتاً فوقتاً نعتیہ اشعار کی صورت میں ہوتا رہتا تھا، بارہا ان سے یہ شعر سنا جو آج بھی ان کے لہجہ کی گھن گرج کے ساتھ کانوں میں گونج رہا ہے:

سنا ہے قبر میں دکھلاتے ہیں شبیہِ نبی
اجل کا اس لئے ہم انتظار کرتے ہیں

آج یقیناً ان کی یہ خواہش پوری ہوچکی ہوگی ۔ قدرت نے اُنہیں آواز بھی خوبصورت دے رکھی تھی، جب کبھی اپنی لَے میں ترنم کے ساتھ اشعار سناتے تو اِک سماں سا بندھ جاتا تھا اور سامعین بھی اپنے سینوں میں عشق کی چنگاری سلگتی محسوس کرتے تھے اور یہی جذبۂ محبت تھا جو انہیں ہر سال کشاں کشاں حرمین شریفین (زادھما اللّٰہ شرفاً) کی طرف کھینچ لے جاتا، جہاں وہ اپنی پیاس بجھاتے اور قلبی تسکین کا سامان حاصل کرتے ۔ سفرِ حرمین کو اپنی اخفاً پسند طبیعت کے موافق حتی الامکان مخفی رکھتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ جامعہ کے اساتذہ کو بھی ان کے حرمین جانے کے بعد سفر کا علم ہوا، دیارِ محبوب کی طرف روانگی کے وقت ان کی کیفیت دیدنی ہوتی تھی، شنیدنی نہیں۔

شعر وشاعری کی بات چھڑی ہے تو آپ کے ادبی ذوق کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا، فرمانِ رسالت کے بموجب ''بعض اشعار پُرحکمت ہوتے ہیں'' اور حدود وآداب کی رعایت کے ساتھ ادبی ذوق نعمتِ خداوندی ہے، ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ پاکیزہ ادبی وشعری ذوق رکھتے تھے، بلا مبالغہ اردو، عربی، فارسی اور پشتو کے ہزاروں اشعار ان کے حافظہ میں محفوظ تھے، موقع کی مناسبت سے اشعار کا برمحل استعمال ان کی گفتگو اور بیانات کو چار چاند لگا دیتا تھا، آج بھی ان کی مترنم آواز میں سنے ہوئے بے شمار اشعار ہیں جو کانوں سے ٹکرار ہے ہیں ۔ ان کا ادبی ذوق صرف شعر سننے سنانے تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ گہرے ادب شناس تھے، ایک بار اردو کے کسی لفظ پر بحث چھڑی تو اپنی رائے کی تائید میں کئی الفاظ پیش کردیئے جو زبان پر ان کی گرفت کی واضح دلیل ہے۔

عربی ادب میں بھی ان کا اپنا مقام تھا، مختلف لہجوں میں بے تکلف گفتگو پر قادر تھے، درسِ حدیث

کے دوران کبھی حدیثِ مبارک میں کوئی غریب لفظ آجاتا تو برجستہ شعر پڑھ کر استشہاد فرماتے، ہمارے درسِ نظامی میں شامل کتب مقاماتِ حریری، دیوانِ متنبّی اور حماسہ کے بے شمار اشعار نوک برزبان تھے۔ اپنے اس ذوق کے باجود وہ جادۂ اعتدال پر قائم تھے، بعض لوگوں پر ادبی ذوق اتنا غالب ہوجاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں انہیں وہ لطف نہیں آتا جو شعر وشاعری میں محسوس ہوتا ہے، حضرت استاذِ محترم اس چیز کو قطعاً ناپسند فرماتے تھے، ایک بار ایک فاضل شاگرد نے عرض کیا کہ: استاذ جی! مجھے آپ سے اشعار سن کر یاد کرنے کا شوق پیدا ہوا، حضرت الاستاذ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''مجھ سے تم نے یہی سیکھا؟ یہ کوئی سیکھنے کی چیز ہے؟''۔ گویا تنبیہ تھی کہ ہر چیز کو اس کا مقام دینا چاہئے، یہ ان کی طبیعت کی اعتدال پسندی کا نتیجہ اور طلبہ کی تربیت کے خاص ذوق کا ایک نمونہ تھا۔

طلبہ کی تربیت کے معاملہ میں ان کا اپنا انداز تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''استوصوا بھم خیراً'' پر وہ پوری طرح عامل تھے، البتہ جس چیز کو ان کے لئے خیر کا باعث سمجھتے اس کو اختیار فرماتے، ہم طلبہ کی جماعت اپنی کوتاہ فہمی اور کم علمی ولااُبالی پن کی بنا پر نہ جانے کن کن چیزوں میں اپنا وقت برباد اور علمی وفکری صلاحیتوں کا ضیاع کرتے ہیں، ہمارے شیخ رحمہ اللہ اس سلسلہ میں بے حد حساس مزاج رکھتے تھے، طلبہ کی حرکات وسکنات، وضع قطع اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ رکھتے اور موقع بموقع تنبیہ واصلاح فرماتے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ: ''اولاد اور طلبہ کی محبت صرف دل میں ہونی چاہئے، اس کا اظہار اِن کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے'' چنانچہ اپنی اولاد کی تربیت کے معاملہ میں بھی ان کا منفرد انداز تھا، جس کے اثرات ان کی اولاد پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور استاذِ محترم حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی دامت برکاتہم نے بھی شہادت کی رات تعزیتی مجلس کے دوران اس کا خصوصی ذکر فرمایا تھا۔ اپنے سرانجام دیئے ہوئے کارناموں کے متعلق حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا حال یہ تھا کہ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ، بڑی سے بڑی خدمات پر بھی اپنا نام نہ آنے دیتے تھے، بلکہ دیگر رفقا کی طرف منسوب کردیتے تھے، آج ملک بھر میں سینکڑوں جگہوں پر اسکول وکالج کے طلبہ کے لئے شروع کیا گیا ''چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس'' دن دوگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے، درحقیقت یہ سلسلہ ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ ہی کی فکر کا نتیجہ تھا، اپنی مسجد (مسجد صالح صدر جہاں امام وخطیب تھے) سے اس کا آغاز کیا، کورس کی کتابیں مرتب کروائیں اور کورس کے دنوں میں جگہ جگہ جاکر جائزہ لیتے، مفید مشوروں سے نوازتے، حوصلہ افزائی کرتے اور کوتاہیوں کی نشاندہی فرماتے، ہر سال جون جولائی کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل مختلف مقامات پر کورس کا انعقاد کرنے والے منتظمین واساتذہ کو جامعہ میں جمع کرکے کورس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے، تدریس کا اسلوب اور دیگر مفید باتیں بتلاتے، یہ ایک پُرکیف مجلس ہوتی تھی، امسال بھی یہ مجلس ۱۹ مئی بروزِ اتوار کو الحمد للہ! اسی جوش وخروش کے ساتھ منعقد ہوئی، بس نگاہیں حضرت استاذ محترم کی متلاشی رہیں اور دل ان کی کمی کو محسوس کرتا رہا:

بہت لگتا تھا جی ان کی محفل میں
وہ اپنی ذات میں اِک انجمن تھے

اس کورس پر اس قدر محنت وجدوجہد کے باجود اپنا نام خود لینا تو درکنار کسی سے سننا بھی گوارا نہ تھا، اس کو بانی جامعہ محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ و دیگر اکابرِ جامعہ کی فکر کا نتیجہ قرار دیتے اور کورس کا نصاب کتابی صورت میں مرتب کروا کر جامعہ ہی کے لئے وقف کر دیا۔

لیکن اخفاءً وخمول کا یہ معاملہ محض اپنی ذات کے ساتھ مخصوص تھا، اپنے پہاڑوں جیسے کاموں کو ذرّہ نہ سمجھتے، لیکن دوسروں کے ذرہ کو بھی پہاڑ کا درجہ دے کر خوب حوصلہ افزائی اور تشجیع فرماتے، اصاغر نوازی بھی ان کا امتیازی وصف تھا، بندہ تاحیات یہ بات نہیں بھول سکتا کہ دورہ حدیث کے سال حضرت استاذِ محترم نے اپنے درسِ صحیح مسلم میں عبارت خوانی کے لئے بندہ کو منتخب فرمایا اور میری بے حد تشجیع فرمائی، ان کے اس عمل نے مجھے کس قدر حوصلہ اور جرأت دی اور آگے بڑھنے کی تحریک پیدا کی، یہ میں اور میرا رب جانتا ہے، نہ جانے کتنی چھپی صلاحیتوں کو مہمیز دے کر نمایاں کیا ہوگا؟ پھر انہوں نے عملی میدان میں آگے بڑھ کر کیا کچھ کارنامے انجام دیئے ہوں گے؟ یہ سب ہمارے استاذ محترم رحمہ اللہ کے نامۂ اعمال کا حصہ ہے، جس کا صلہ رب انہیں ضرور دے گا، ان شاء اللہ!

صالح مسجد (صدر) جہاں آپ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، شہر کی مرکزی مساجد میں شمار ہوتی ہے، اس مسجد کی اہمیت کی بنا پر وہ بجا طور پر اس کا حق ادا فرماتے تھے، یہیں سے ۱۹۹۸ء میں ''چالیس روزہ کورس'' کا آغاز کیا جو بعد میں موجودہ شکل تک پہنچا، مسجد کے نمازی بھی آپ سے محبت کرتے تھے، بہت سے لوگ آپ کی اقتدا میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے دور دور سے آتے تھے، ہمارے تخصص کے ایک ساتھی کے قریبی عزیز ہر جمعہ کو صرف استاذِ محترم کا بیان سننے اور آپ کی اقتدا میں نمازِ جمعہ پڑھنے کے لئے حیدرآباد سے سفر کر کے آتے تھے، جمعہ کی نماز کے لئے مسجد کھچا کھچ بھر جاتی، اور نمازیوں کی کثرت کی بنا پر متصل جہانگیر پارک میں بھی ٹینٹ لگا کر صفیں بچھائی جاتی تھیں، اگرچہ وہ معروف معنوں میں جلسے جلوسوں کو گرمانے والے خطیب نہیں تھے، لیکن ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق ان کی دل سے نکلی ہوئی باتیں دلوں پر اثر کرتی تھیں اور عوام الناس اپنی زندگیاں بدل لیتے تھے۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے کمرے میں ان کی یادگاروں کو دیکھ کر بھی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں، سچ یہ ہے کہ:

جہانے را دِگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

آپ کے فیض یافتہ نمازی، دیگر لوگ اور آپ کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد، آپ کی نیک صالح اولاد، آپ کا جاری کردہ کورس اور نہ جانے کیا کچھ آپ کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

شیخ عطاؒ شہیدؒ کی چند وہبی وکسبی نمایاں خوبیاں!

ابوالوفاءالمشہدی

یوں تو حق تعالیٰ شانہ نے ہر انسان کے اندر دو چار خوبیاں رکھی ہوتی ہیں جو اس انسان کی شخصیت اور مقام ومرتبہ کا پتا دیتی ہیں، مگر بعض انسانوں میں عادت ومعمول سے زیادہ کچھ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو انسان کی اپنی شخصیت ومنزلت کی عکاس ہونے کے علاوہ دوسروں کے لیے بہترین نمونہ اور راہ نما اصول کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ ایسے ہی منفرد اور یگانہ روزگار انسانوں میں سے ایک عظیم انسان، استاذ مکرم، شیخ معظم حضرت مولانا عطاء الرحمن نور اللہ مرقدہ بھی تھے، جن کی عملی زندگی کے بعض نمایاں پہلو، انسان کی شخصیت سازی اور کردار سازی کے لیے بہترین مثال اور مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند خوبیاں اور بعض نمایاں پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ؎

تا بدانی کہ بچندیں صفات آراستہ بود

اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ عطاء الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کو جن وہبی وکسبی خوبیوں سے آراستہ فرمایا تھا، ان میں اخلاص وللّٰہیت، صورت وسیرت، ذہانت وفطانت، قابلیت ولیاقت، شفقت ورحمت، الفت ومحبت، فدائیت وفنائیت، امانت ودیانت، تقویٰ وطہارت، مواسات واخوت، ادب وعقیدت، غیرت وحمیت، حوصلہ وہمت، خودی وخودارادیت، بے تکلفی وبذاذت، شرافت ونجابت واثر پذیری وجاہت، کشش وجاذبیت، رعب وحشمت، احترام وعظمت، اخلاق ومروت اور علمیت وعملیت بطور خاص نمایاں تھیں۔

اس کے علاوہ جامعہ سے بےلوث تعلق اور ہمہ وقت فکرمندی، علمی رسوخ کے ساتھ تدریسی شغف، ریاونمود سے دوری، حب جاہ سے نفرت، حسن معاملگی، اقرباء پروری اور استثنائی سوچ سے ماورائی، اکابر پر بے پناہ اعتماد اور ان کے مرتبۂ احترام کی مکمل پاس داری، جادہ حق پر سختی سے کاربندی، افراط وتفریط سے اجتناب، مردم سازی اور مردم شناسی میں بے مثال، قوت فیصلہ اور دور اندیشی میں بے بدل، افادہ میں تخصیص کی بجائے تعمیم کے روادار، بلا امتیاز نصح وخیرخواہی سے سرشار،

چھوٹوں پر عنایات ونوازشات میں مجسمۂ جود وسخا، دوسروں کی حوصلہ افزائی اور تشجیع میں سخاوت کی انتہاء، دوسروں کی حسنِ کارردگی کا فراخ دلی سے برملا اعتراف، چھوٹوں کی معمولی معمولی صلاحیتوں کے قدردان، کمزوروں کے بہی خواہ اور بے کسوں کے غم خوار، حد درجہ کفایت شعار اور خود دار، پیکر صدق و وفا، خود پیچھے رہ کر دوسروں کو نمایاں کرنے کے جذبے سے مالا مال،، یہ آپ کی وہ چند نمایاں خوبیاں تھیں جو حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی میں واضح طور پر جھلکتی تھیں، جنہیں اپنی فہم کوتاہ کے مطابق، اس مختصر مجلس میں برجستہ قلم زد کررہا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ان کی بلند و بالا شخصیت!

ما تماشا کنان کوتہ دست　　　　تو درخت بلند و بالائی

ممکن ہے کوئی قاری درج بالا سطروں کو بے جا تکلف یا محض لفاظی سمجھے، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ الفاظ درحقیقت بندہ کے اس ذہنی خاکہ کے ذیلی عناوین ہیں جو حضرت استاذ محترم کے شخصی خاکے سے متعلق دل و دماغ میں موجزن ہیں، ان تمام عناوین کے مندرجات ومحتویات کی تفصیلات تحریر میں لانے کا زبردست داعیہ اور محرک دل میں موجود ہے، آپ کی شہادت با سعادت سے تاحال اسی کوشش میں رہا کہ تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کروں، مگر تاخیر در تاخیر سے یہ خیال بار بار آنے لگا ہے کہ شدید قلبی تقاضے اور فرواں مواد کی موجودگی کے باوصف، کچھ لکھنے کی نوبت نہ آنا، ممکن ہے استاذ محترم کے خاص روحانی تصرف کا نتیجہ ہو، کیوں کہ وہ جس طرح زندگی میں اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں حقیقت کشائی کو ناگوار سمجھتے تھے، شاید اسی طرح بعد از مرگ ناگہاں بھی اس کے روادار نہیں ہیں۔

لیکن حضرت شیخ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے جب کبھی بے تکلف روحانی ملاقات ہوگی تو بصد اصرار، اجازت طلبی کروں گا اور ان سے یہ عرض کروں گا کہ آپ نے اپنی ذات اور شخصیت کو اخفاً کے دبیز پردوں میں زندگی بھر جس قدر چھپا رکھا تھا، آپ کی شہادت اور آپ کے جنازے کے ہجوم سے وہ پردے ہٹ چکے ہیں۔ دنیا پر آپ کی شخصیت اور آپ کا مقام رفیع آشکارا ہو چکا ہے اور آپ علامہ ابن السماک رحمہ اللہ کے اس جملے کے مصداق بن چکے ہیں جو انہوں نے داؤد الطائی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ملال پر ان کے پیرو کاروں کی حالت اور جنازے کے شرکاء کے ہجوم کو دیکھ کر ارشاد فرمائے تھے۔ ہم علامہ ابن السماک رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کے ساتھ اپنے شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ:

لو رأيت اليوم كثرة تبعك، لعرفت ان ربك قد اكرمك

الغرض آپ نے زندگی بھر تواضع وخمول اور اخفاً کا جو اہتمام فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ ادا شاید بہت پسند تھی، اس لیے آپ کی قدر ومنزلت کا دنیا پر عیاں ہونا تکوینی معاملہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی کچھ کہنے اور لکھنے کی روحانی اجازت دیں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق کی استدعا بھی فرمائیں کیوں کہ

نالہائے خانگی دل راتسلی بخش نیست　　　　سر بہ صحرا می زنم، فریاد خاطر خواہ نیست

دارالعلوم دیوبند کا قیام اور مفتی سعید خان کا انکشاف

حافظ زاہد حسین رشیدی سُنی اکیڈمی، چکوال

''سبحان اللّٰہ! آپ فرماتے ہیں: ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔'' (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، سوانح قاسمی جلد۲،ص۲۲۳)

حضرت مولانا مفتی سعید خان صاحب الندوۃ ایجوکیشنل ٹرسٹ چھتر پارک اسلام آباد کے بانی اور ماہنامہ ''الندوۃ'' اور ''المناد'' کے بعد اب جامعہ مدنیہ لاہور کے ترجمان ماہنامہ ''الحامد'' کے مدیر ہیں۔

۱۹۹۵ء کے معروف خلافت آپریشن کے حوالہ سے مذہبی حلقوں میں متنازعہ حیثیت سے بھی متعارف ہیں اور مرزائیت ومرزائیت نوازی سمیت دیگر کئی ایک الزامات کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہیں۔

خدا جانے رقیبوں کی شیریں لبی کا کمال ہے یا ہمارے مخدوم کی وسعتِ ظرفی؟ یا کچھ اور؟ مفتی صاحب کو کبھی بے مزہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

مفتی سعید خان صاحب کی کتابِ زندگی کا ٹائٹل بہت خوش نما ہے۔ مہمان نواز، ہنس مکھ، وسیع لائبریری، معلومات کا ذخیرہ اور دھیما مگر دل میں راہ کر جانے والا اندازِ بیاں۔ تاہم تفصیلی مطالعہ کی نوبت نہ انہوں نے آنے دی اور نہ ہم اپنی بساط کو دیکھتے ہوئے کوئی سبیل نکال سکے۔

چونکہ ان سطور سے مقصود حضرت مفتی صاحب کو دل نشین شخصیت کی زیرِ بحث لانا نہیں، اس لئے ''قصہٴ جاناں'' سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم اپنے مطلب کی بات پر آتے ہیں۔

ستمبر۲۰۱۱ء کے کسی ستم گر پہر میں ہمیں دارالعلوم دیوبند (وقف) کا ترجمان ''مجلّہ ترجمان دارالعلوم

دیوبند'' موصول ہوا۔ جس میں مولانا وارث مظہری صاحب کے سفرِ پاکستان کی روئیداد ''اسلام آباد کا سفر'' کے عنوان سے شاملِ اشاعت تھی۔ اس سفر نامہ کے صفحہ ۶۲/۶۳ پر حضرت مفتی صاحب موصوف کے متعلق ایک لرزہ خیز تحریر موجود ہے۔

ہماری گذارشات سے قبل اس تحریر کو بغور پڑھ لیجیے:

''رات میں کھانے کی میز پر مختلف اہم میزبان شخصیات میں سے ایک مفتی سعید صاحب بھی تھے۔ لاہور کے ہمارے کرم فرما سجاد الٰہی صاحب سے ہماری فون پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مفتی صاحب ہم سے اسلام آباد میں ملیں گے اور لاہور آنے کی راہ ہموار کریں گے۔ کیوں کہ ہمارا ویزا صرف اسلام آباد کے لئے ہی مخصوص تھا، اس لئے ان سے بطور خاص ملنے سے دلچسپی تھی۔ سجاد الٰہی صاحب ایک بہت بڑے تاجر ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہایت علم دوست۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر ہندوستان سے شائع ہونے والی اہم اردو کتابیں اور درجنوں رسائل ومجلّات منگواتے اور انہیں اہل ذوق تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہمارے میزبانوں نے بتایا کہ مفتی صاحب نہایت متمول ہونے کے ساتھ سیاسی اثر ورسوخ کے حامل اور علمی ذوق کے مالک ہیں، چناں چہ ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بڑی تعداد میں اہم کتابوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ مولانا علی میاں ندوی کے مسترشد اور خلیفہ ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ''مفتی'' ان کے نام کا جز تھا یا حقیقت میں انہوں نے افتا کی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ کھانے کی میز پر ان کی خوش طبعی اور اخلاق وتواضع متاثر کن تھا، لیکن ان کی باتیں بہت سنجیدہ نہیں تھیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ چھیڑ چھاڑ والی تھیں۔ ایک بات تو انھوں نے ایسی کہی جو ہم میں سے کسی کو بھی ہضم نہیں ہو پائی۔ انھوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطا کی تھی، نہ صرف یہ، بلکہ اس کی تاسیس میں انگریزی حکومت کے کارندے بھی شریک تھے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خود انگریزی حکومت کے تعاون واشتراک سے دارالعلوم کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے اس کے لئے ''بشارت'' نامی کتابچے یا تحریر کا حوالہ دیا جو ان کے بقول خود دارالعلوم کی ابتدائی رودادوں میں شامل ہے۔ میری اس بات کو

انھوں نے سرے سے قابل اعتناء نہیں سمجھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مخالفین نے جن کی تعداد ماشاء اللہ کم نہیں ہے، ہندوستان و پاکستان سے لے کر بعض عرب ممالک تک مختلف زبانوں میں اس کے خلاف درجنوں کتابیں لکھ کر نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، کبھی ایسا الزام اس پر نہیں لگایا۔ حالاں کہ ان کے لئے یہ انکشاف اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی اور ہلاکت سے کم سنسنی خیز نہیں تھا۔ جنگ شاملی کے جرم میں مولانا قاسم نانوتویؒ سمیت بانیان واکابر دارالعلوم دیوبند کا ہمیشہ حکومت کی طرف سے تعاقب کیا جاتا رہا۔ رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار ہو کر جیل بھی گئے۔ لیکن مفتی سعید صاحب کے لئے گویا یہ ساری باتیں بے معنی تھیں۔ وہ اخیر تک ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' پر مصر رہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مرشد مولانا ابوالحسن علی ندوی کے لئے بھی یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہوتی۔ اس نشست میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مزعومہ شراب نوشی پر بھی گفتگو چھیڑ دی، جس سے طبعی تکدر فطری تھا۔

(مجلّہ ترجمان دارالعلوم دیوبند اپریل تا جون ۲۰۱۱ء)

محترم قارئین! حضرت مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف کو ایک نظر پھر گہری نظر سے پڑھیے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دیوبند کے فرزندوں کے لیے ان کے مادرِ علمی اور مرکزِ رشد و ہدایت کے متعلق یہ کہنا (کہ نہ صرف اس کی زمین انگریز کی عطاء ہے بلکہ اس کی تقریب تاسیس میں ان کے نمائندے بھی شریک ہوئے) ایسی گالی ہے جسے کوئی باہوش اور غیرت مند بیٹا برداشت نہیں کرسکتا؟!۔

باوجود اس کے ہم نے حضرت مفتی صاحب سے رابطہ ضروری خیال کیا۔ اس امکان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ شاید وارث مظہری صاحب نے مکمل غلط بیانی سے کام لیا ہو یا مفتی صاحب کی گفتگو (Miss Code) کی ہو۔

چنانچہ ہم نے یکے بعد دیگرے تین خطوط ان کی خدمت میں ارسال کئے، تاکہ وہ اس مبینہ انکشاف کی تردید یا وضاحت فرمادیں۔ ہماری یہ التجائیں بھی ایک نظر دیکھ لیجیے:

''بگرامیٔ خدمت حضرت مفتی صاحب زیدمجدکم:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گذشتہ دنوں مجلّہ ترجمان دارالعلوم دیوبند (انڈیا) اپریل تا جون ۲۰۱۱ء دیکھنے کو ملا، جس میں وارث مظہری صاحب کا سفرنامہ ''اسلام آباد کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یقیناً آنجناب کی نظر سے گزرا ہوگا۔ وارث مظہری صاحب نے

آپ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''انہوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریز حکومت نے عطاء کی تھی۔''

اس حوالہ سے کوئی رائے قائم کرنے یا تبصرہ کرنے اور آگے نقل کرنے سے قبل دیانتاً ضروری خیال کیا کہ آنجناب کی رائے معلوم کرلی جائے، امید ہے انتظار کی کوفت سے بچاتے ہوئے جلد اپنے نکتۂ نظر سے آگاہ فرمائیں گے۔ (۲۷ستمبر۲۰۱۱ء)

اس عریضہ کی وصولی کی اطلاع ہمیں مفتی صاحب نے بنفسِ نفیس دی۔ ہمارے ایک دیرینہ اور مشترکہ دوست بھی ان کے ہمراہ تھے اور خوشی کا اظہار بھی کیا کہ آپ نے مجھ سے رابطہ کرکے ٹھیک کیا اور وعدہ فرمایا گیا کہ بہت جلد اس کی وضاحت کردی جائے گی۔

تاہم ایک مہینہ کے انتظار کے بعد بھی جب مفتی صاحب نے اپنا نکتۂ نظر بیان نہ فرمایا تو دوسرا عریضہ ارسال کیا گیا، جس میں دردِ دل یوں ذکر تھا:

''وارث مظہری صاحب کے مندرجات کی توضیح کا آں جناب نے جو وعدہ فرمایا تھا تاحال وفا نہیں ہوسکا: کسی بھی چیز کے نقصان سے بسا اوقات آپ جیسے بڑے اتنے آگاہ نہیں ہوسکتے، جتنے ہم چھوٹے کثرتِ مجالست یا بے تکلفی کی وجہ سے ہوجاتے ہیں۔ میری گزارش کی بنیاد یہی ہے، باقی زہے نصیب، جو مزاجِ یار میں آئے''۔ (۳۰اکتوبر۲۰۱۱ء)

ہمارا یہ خط بھی حضرت مخدوم کو وصول ہوا، جس کی اطلاع ہمیں بذریعہ فون دی گئی۔ اس موقع پر موصوف فون پر ہی وضاحت کے موڈ میں تھے، جبکہ ہم ٹریفک میں پھنسے راستہ تلاش کرنے کی جستجو میں۔ چنانچہ تفصیلی بات نہ ہوسکی، البتہ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ سلفی صاحب اور دیگر کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ وضاحت نہ کی جائے۔ راقم نے گزارش کی کہ اگر آپ نے کہیں ایسی کوئی چیز پڑھی ہے تو اس کی توجیہ بھی تو ممکن ہے، لیکن اس معاملہ کو نظر انداز کرنا قائلین کے نیچے مٹی دبا دینے کے مترادف ہوگا، لہٰذا آپ قلم پکڑیئے اور بسم اللہ کیجیے۔

ڈیڑھ ماہ خاموشی رہی، بالآخر ہم نے اسے توڑتے ہوئے تیسرا عریضہ لکھا، جس میں ہم نے کچھ یوں فریاد کی:

ماہنامہ ''الحامد نومبر ۲۰۱۱ء'' نظر نواز ہوا، ابتدائی سطور میں آنجناب نے بالکل بجا لکھا ہے:

''مسلمہ قاعدہ ہے کہ انسان کی زبان سے زیادہ اس کی تحریر قابل اطمینان

ہوتی ہے۔''

شاید اسی بنیاد پر راقم کی گذارش تھی کہ مجلّہ ترجمانِ دارالعلوم میں اپنے کوڈ شدہ الفاظ کی آنجناب اپنے قلم سے وضاحت فرمادیں گے تو ریکارڈ درست ہوجائے گا اور شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جائیں گے۔ بصورتِ دیگر آپ کی طرف سے کسی تردید کا نہ آنا مروجہ اصولوں کی بنیاد پر آپ کی تائید تصور ہوگا۔ ارشاد کے مطابق سلفی صاحب سے بات کی تھی، انہیں آپ نے اپنی وضاحت کا جو خاکہ بتایا، وہ اس پر مطمئن نہ تھے۔ نفسِ وضاحت پر سلفی صاحب یا کسی اور بزرگ کو کیا اشکال ہوسکتا ہے؟۔ (۱۴دسمبر۲۰۱۱ء)

اس عریضہ کی وصولی کی تاحال ہمیں براہِ راست کوئی اطلاع نہ مل سکی، لیکن حضرت مفتی صاحب کی طرف سے گہرا سکوت ہماری الجھن دور نہیں کرسکا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجلّہ ''ترجمان دارالعلوم'' کے بعد یہ سفرنامہ ماہنامہ ''افکارِ ملی علی گڑھ (انڈیا) جولائی ۲۰۱۱ء'' میں بھی چھپ چکا ہے اور وہ طبقات جو بزرگانِ دیوبند کو مطعون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، ان رسائل کی فوٹو کاپیز کرواکر تقسیم کررہے ہیں اور یہ تاثر پھیلا رہے ہیں کہ اب تو گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھادیا ہے۔

خدا کرے! ہماری یہ سطور ان ناعاقبت اندیش دوستوں کے لئے آئینہ ثابت ہوں اور وہ مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف پر بغلیں بجانے کے بجائے بزرگان دیوبند کو تاریخ، روشن ماضی اور چاردانگِ عالم پھیلتے علمی وروحانی فیضان کی روشنی میں دیکھ سکیں:

اِن خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

دارالعلوم دیوبند کے قیام کی مختصر تاریخ:

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد، قیام کی ضرورت اور احوالِ واقعی کے متعلق حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تحریر اساسی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی جامعیت ان سب تحریرات سے بے نیاز کردیتی ہے جو اس حوالہ سے لکھی گئی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہوچکا تھا۔ صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کررہا تھا۔ دہلی کا تختِ مغل اقتدار سے خالی ہوچکا تھا۔ صرف ڈھول کی منادی میں ''ملک بادشاہ کا'' رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہوجانے کی وجہ سے ختم ہورہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ دینی شعور

رخصت ہورہا تھا اور جہل وضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا رہا تھا۔مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کی بجائے جاہلانہ رسوم ورواج، شرک وبدعت اور ہواپرستی وغیرہ زور پکڑتے جارہے تھے۔مشرقی روشنی چھپی جارہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہورہا تھا، جس سے دہریت والحاد فطرت پرستی اور بے قیدیٔ نفس، آزادی فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہوچلی تھیں۔اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خدوخال کا پہچاننا مشکل ہوچکا تھا۔چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدہم ہوتے جارہے تھے اوران کی جگہ زاغ وزغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی اوراسی قسم کے ہزارہا حوادث اورالمناک واقعات کے چنداجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

اند کے باتو بگفتیم و بدل ترسیدیم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہوچلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی، اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہوچکا ہے کہ اچانک چندنفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اورکسک محسوس کی۔یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اوراس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اوراس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جواس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجزاس کےاور کچھ نہ تھی کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اورتعلیم وتربیت کے راستہ سےان کے دل ودماغ کی تعمیر کر کےان کی بقاء کا سامان کیا جائے اوراس کی واحدصورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علومِ نبویہ پڑھائے جائیں اوران ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اورتمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے، جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی راہ نمائی ہواور دوسری طرف خارجی مدافعت۔نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان دارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ان مقاصد کے لئے کمرباندھ کراٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہنما

اور لیڈر نہ تھے، بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی باہمی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلہ خیال نہ تھا، بلکہ تبادلۂ الہامات تھا، جیسا کہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سادس دار العلوم دیوبند سے سنا کہ وقت کے اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت بقاء مدرسہ ہے، چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظ دین و مسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ: مدرسے کا قیام ضروری ہے، کسی نے کہا: مجھے صریح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ: ان حالات میں مدرسے کا قیام بہت ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالم غیب کا مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی نہ تھی، بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی، جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی، کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا، جس کے تدارک کی فکر تھی، وہ پورے ملک میں پڑ رہا تھا، اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی، بلکہ اس میں عالمگیری پنہاں تھی۔ گو ابتدا سے اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں شجرہ طیبہ لپٹا ہوا تھا، جس کی جڑیں قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے، جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھا اور اسے ایک تجویز کی صورت دی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دار العلوم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ (بیس بڑے مسلمان ص: ۲۴ تا ۲۶)

بانی دار العلوم کے طے کردہ بنیادی اُصول:

حضرت مفتی صاحب کے مبینہ انکشاف میں تو بزرگانِ دیوبند پر دار العلوم کے لئے زمین

لینے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ جبکہ حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ فرزندانِ توحید رجوع الی اللہ کو اصل سرمایہ قرار دیتے تھے۔ چنانچہ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم کے جو آٹھ اساسی اصول طے فرمائے، ان میں سے آخری تین حسبِ ذیل تھے:

ا:... اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

۲:... سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۳:... تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندے سے اُمیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ (بیس بڑے مسلمان ص: ۲۷)

فرمائیے! جہاں بنیاد کے وقت یہ طے کیا جارہا ہو کہ......

ا:... مدرسہ کی کوئی یقینی آمدنی نہ ہوگی۔

۲:... مدرسہ بشرطِ توجہ الی اللہ چلے گا۔

۳:... اصل سرمایہ خوف ورجاء ہوگا جو رجوع الی اللہ سے حاصل ہوگا۔

۴:... سرکار اور امراء کی شرکت مضر تصور ہوگی۔

۵:... صرف مخلص اور حسنِ نیت کے حامل لوگوں سے چندہ لیا جائے گا۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے مدرسہ کی بنیاد کے لئے انگریز سے زمین لیں؟ اور انہیں تقریبِ تاسیس میں شریک کریں؟۔

خود دار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم پر
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی
(شکیب جلالی)

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں:

دارالعلوم کی بنیاد کیسے رکھی گئی؟ اور بانیانِ دارالعلوم کے مقاصد واہداف کیا تھے؟ کن پیشین گوئیوں کی بنیاد پر تھے؟ ان سب سوالوں سمیت دیگر متعلقہ پہلوؤں کا جواب حضرت حکیم

الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی جامع ترین تحریر میں موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے!

''دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے، اسی درخت کے نیچے سے آبِ حیات کا چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کر دی اور دوسری طرف اس نے تیز و تند، شرک ''بدعت'' فطرت پرستی، الحادودہریت اور آزادیٔ فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ہٹانا شروع کر دیا، جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دکھایا تھا۔ بانیٔ دارالعلوم کا یہ خواب کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں، پورا ہوا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کا یہ خواب کہ: ''علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں'' خواب ہی نہ رہا، بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہوگیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعے ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے، جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزارہا علماء کا علم ہوگیا۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ: ''مجھے اس جگہ سے علم کی بو آئی ہے، پس وہ خوشبو جس کو سید صاحبؒ کی روحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا، ایک سدا بہار گلاب کے پھول، بلکہ گلاب آفرین درخت کی شکل میں آگئی، جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلدستہ بنے گی اور اس گلدستہ کی خوشبو سے سارا عالم انسانی مہک اُٹھے گا اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں، وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں نئی فاتح قوم انگریز کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس

طرح ڈھالا جائے، جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے۔ ظاہر ہے کہ دل و دماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہوسکتی تھی، جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں دلوں اور دماغوں کو ڈھالا ہے، جن کو لے کر تعلیم آگے آئی ہے، اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ: ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نو جوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

یقیناً یہ آواز جب کہ ایک فاتح او برسر اقتدار قوم کی طرف سے اور تھا بھی وہ تعلیم کا، جو بذات خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اس نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھرنی شروع ہوگئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں، لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں نمایاں ہونے لگیں اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ:

''ہماری تعلیم وتمدن کا مقصد ایسے نو جوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو''۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یکطرفہ نہ رہی، بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جنبہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہوگیا۔ جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک وتر کو بہا لے جائے گا، اگر اس کی روکا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں، جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ بہرحال وہ ساعت محمود آ گئی کہ مدرسہ کا آغاز ہوا اور اس کی تعمیری و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساخت وجود پر آ گئی۔ ملا محمود دیوبندیؒ نے (جو حضرت بانی دارالعلوم کے امر پر مدرسۂ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد کو کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر کسی

عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو، بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی کا رد کار اور جذبہ، نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر و اشتہارات کی بھرمار، بس ایک شاگرد اور ایک استاذ، شاگرد بھی محمود استاذ بھی محمود۔ دونفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آ گئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا، جو سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہے۔ مقصد نہ ترفہ تھا، نہ تنعم، نہ تعیش، نہ تزین، نہ تفاخر، نہ تکاثر، بلکہ صرف ''ما أنا علیه و أصحابیؓ'' کا مرقع بنانا اور ''علیکم بسنتي'' الخ ''وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ'' کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچی تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط و اعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراط مستقیم کے یہ خطوط کہیں ان بہتر ۷۲ فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سبل متفرقہ کہا گیا ہے۔ اس لئے جامعیت و اعتدال اور دین و دانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم وتربیت کا خط مستقیم کھینچا گیا''۔ (بیس بڑے مسلمان ص۳۰/۲۹)

محترم قارئین! حضرت قاری صاحبؒ کی تحریر آپ نے ملاحظہ کی، گہری نظر سے جائزہ لیجیے، بزرگانِ دیوبند نے اس عظیم درس گاہ کے قیام کے وقت جو خواب دیکھا تھا، کیا آج اس کی تعبیر ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے؟ محض عقیدت ہی نہیں، حقیقت کی نگاہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ سے بھی کام لیا جائے تو یہ نتیجہ نکالے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس درس گاہ کی بنیادیں جس خلوص پر رکھی گئیں، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔ انگریز کی عطاء کردہ زمین سے یہ نتائج تو نکلنے سے رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ درس گاہِ دیوبند اس چبوترہ کا تسلسل ہے، جہاں پیغمبر ﷺ کے اصحاب فیضانِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ جس طرح حضرت قاری صاحبؒ کی تحریر سے واضح ہے کہ سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہمارا مقصود ہے۔ ہمارا مقصود ترفہ ہے، نہ تنعم، تعیش ہے، نہ تزین، تفاخر ہے، نہ تکاثر، بلکہ صرف ''ما أنا علیه وأصحابي اور علیکم بسنتي'' کی راہ...... گویا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(اقبالؒ)

بزرگانِ دیوبند کی انگریز کے خلاف جدوجہد:

ہندوستان کا خطہ روحانی پیشواؤں کا مرکز تھا، جس کے زیر اثر یہاں کے باشندوں میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کہ ایک مثالی انسان میں ہونی چاہئیں۔ لیکن ظالم انگریز نے تجارت کے بہانے یہاں قدم جمائے، تو نہ صرف یہ کہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرلیا، بلکہ اپنی بے ہودہ تہذیب، فرسودہ نظامِ تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے ہندوستان کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کردیا۔

فخر الہند حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حالات کی نزاکت بھانپتے ہوئے فرنگی اثرات کے انسداد کی غرض سے انقلابی جماعت کی بنیاد رکھی۔ بزرگانِ دیوبند کے مرشد قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اس مزاحمتی قبیلہ کے چوتھے امیر مقرر ہوئے تو انگریز کے خلاف باقاعدہ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی شروع کردی۔ آپؒ کے رفقاء میں بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علاوہ قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبدالغنیؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ وغیرہ حضرات شامل تھے۔

حضرت حاجی صاحبؒ امام مقرر ہوئے، حضرت نانوتویؒ سپہ سالار اور حضرت گنگوہیؒ قاضی، جبکہ تھانہ بھون کو دارالسلام قرار دیا گیا۔ اس موقع پر مولانا شیخ محمد تھانویؒ نے بے سروسامانی کی طرف اشارہ کیا تو شیخ نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے فرمایا: ''کیا ہم اصحابِ بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟''

تفصیل بہت دل چسپ بھی ہے اور روح فرسا بھی۔ بزرگان دیوبند نے اس جدوجہد میں کیا کیا، کیا؟ اور کیسے کیسے قربانیاں دیں؟ بلاشبہ وہ جہاں رکے، کوہِ گراں ثابت ہوئے اور جب چلے تو جاں سے گذر گئے۔ ظالم انگریز نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں ان سرفروشوں پر روا رکھیں اور اصحابِ محمد کے یہ روحانی فرزند کس طرح سینہ تان کر ہر ظلم سہتے رہے، اس کا اندازہ مسٹر رسل کے اس اعتراف سے لگایا جاسکتا ہے۔: ''مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انہیں جلا دیا گیا''۔

(تمغہ کا دوسرا رخ، مصنفہ ایڈورڈ ٹامس، ص: ۴۸۰ بحوالہ بیس بڑے مسلمان، ص: ۱۲۰)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، انگریز کے مظالم، بزرگانِ دیوبند کی جدوجہد، عیسائیت کے پھیلتے اثرات کو دیکھتے ہوئے غلبۂ اسلام کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام اور ایک طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان کی آزادی کا لمحہ لمحہ تاریخ کے ریکارڈ پر ہے، جو تاریخ کے طالب کے لئے شاید محض دل چسپی کا سامان ہو، لیکن دیوبند کے بیٹوں کے لئے قابل فخر بھی ہے اور لائقِ تقلید بھی۔ تفصیلات کے لیے تاریخ سے رجوع کرنا چاہئے۔ یہاں اس سرگذشت کے اجمالی ذکر سے مقصود صرف حضرت

مولانا مفتی سعید خان صاحب کے اس مبینہ انکشاف:

''دارالعلوم دیوبند کی جو پہلی تعمیر ہوئی ہے، اس کے لئے ضروری اراضی بانی دارالعلوم کو انگریزی حکومت نے عطاء کی تھی''۔

کا امکانی جائزہ لینا ہے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جن بزرگوں نے سالہا سال جس انگریز کی منحوس تہذیب، تعلیم، ناجائز قبضہ اور ہندوستان کو عیسائی اسٹیٹ بنانے جیسی کوشش کو ناکام بنانے کے لئے ایک طویل جدوجہد کی ہو، وہ اتنے سادہ تھے کہ انہی عطار کے لونڈوں سے دوا لیتے ہوئے اپنے علمی وروحانی مرکز کے لئے زمین لے لیں: **فیا للعجب!**

یا پھر انگریز اتنا باؤلا تھا کہ گویا سانپوں کو دودھ پلانے لگا اور اپنے خلاف جارحانہ عزائم رکھنے والوں کو مرکز قائم کرنے کے لئے زمین الاٹ کردی؟

کیا حضرت مفتی صاحب اس عقدہ کو حل کرسکتے ہیں؟؟؟:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
(اقبالؒ)

کاش! شورش کاشمیری زندہ ہوتے:

حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کو جو سنہری اصول عطاء کئے ہیں ان میں ایک اصول اپنی معنویت، گہرائی اور اثرات کے حوالہ سے ایک جہان رکھتا ہے: **"اذکروا محاسن موتاکم"** یعنی ''اپنے مردوں کی اچھی باتیں ذکر کیا کرو''

عقائد ونظریات کی بات الگ ہے، تاہم اگر کہیں عملی کمزوری موجود ہے تو بجائے اس کے اس فرد کی اچھی باتیں بیان کی جائیں، خدا جانے حضرت مفتی صاحب کی دلربا شخصیت یہ انکشاف کیسے کربیٹھی؟ کہ وارث مظہری چکرا کر رہ گئے کہ:

''اس نشست میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مزعومہ شراب نوشی پر بھی گفتگو چھیڑ دی، جس سے طبعی تکدر فطری تھا۔''

کاش مولانا ابوالکلامؒ کے عاشقِ زار جناب شورش کاشمیری مرحوم حیات ہوتے تو تڑپ کر رہ جاتے اور اپنے محبوب آزادؒ کی وکالت کرتے یا حضرت مفتی صاحب موصوف سے حساب مانگتے......

ہندوستان میں ابن تیمیہؒ:

آغا شورش کاشمیریؒ کو حضرت آزادؒ سے گہرا لگاؤ تھا، انہوں نے ''ہندوستان میں ابن تیمیہؒ''

نامی کتاب سمیت دیگر کئی ایک تحریرات میں مولانا آزادؒ کی شخصیت سے پردہ اٹھایا ہے: چند ایک شذرات مذکورہ کتاب سے ملاحظہ کیجیے اور مولانا آزادؒ کی باغ و بہار شخصیت اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگائیے:

''مولانا ابوالکلام آزادؒ ماضی کی کوئی داستان نہیں، ایک زندہ و تابندہ فکر، پختہ اسلامی سیرت کا نمونہ، وقت کی تاریکیوں میں روشنی، دین کی صداقت پر حجت، آیت من آیات اللہ، عصرِ حاضر میں مذہب، تعلیم اور تہذیب و معاشرت کے پیچیدہ مسائل میں چراغِ ہدایت اور سیاست کی پر پیچ راہوں میں ایک راہ نما قدم ہیں''۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ص:۱۳)

''ابوالکلامؒ نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلامؒ نہیں ہوسکتا''۔ (آغا شورش کاشمیریؒ: ص:۱۸)

عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہؒ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک ان کے بت پجتے ہوتے، لیکن وہ مسلمانوں میں تھے، اس لئے ان کے حصے میں وہ سب کچھ آیا جس سے علمائے امت کی جبینیں لبریز ہیں۔ (آغا شورش کاشمیریؒ: ص:۱۸)

''ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابنِ تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ اور اُمیہ بن عبدالعزیزؒ کے حالات تو نہیں لکھ رہا''۔

(مولانا سید سلیمان ندویؒ: ص:۴۷)

ڈوبتی رات کے ساتھ سورۂ یٰسین پڑھی گئی، بالآخر سوا دو بجے شب موت نے اس عظیم انسان کے لئے اپنا دامن وا کر دیا جو اس گئے گزرے دور میں سب سے بڑا مسلمان تھا، اللھم اغفرلہ کنگ ایڈورڈ کی کوٹھی میں سینکڑوں لوگ ٹھٹھرتی ہوئی رات کو اپنے دل کی گرمی پہنچا رہے تھے، جب ٹوٹتی ہچکی نے ان کے کان میں کہا: ''تمہارا مرجعِ ارادت اپنے اللہ کے پاس چلا گیا۔''

کہرام مچ گیا، دہلی نے آخری بار سر جھکا دیا کہ اس کی عظمت کے طاق پر جلتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی ہے، تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کے ساتھ اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا اور جہاں جہاں جھنڈے جھکائے جا رہے تھے، وہاں لوگوں نے اپنے دلوں کے پرچم جھکا دیئے تھے کہ اس دور کا ابن تیمیہؒ رحمتِ خداوندی کی گود میں جا تا ہے۔ (آغا شورش مرحوم: ص:۸۷)

مولانا احمد سعید دہلویؒ صدر جمعیۃ علماء ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ امام نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا تو قلعہ اور مسجد کا قلب

ایک مرتبہ پھر نعرۂ تکبیر ''اللہ اکبر'' کی صداؤں سے معمور ہوگیا۔اور جب میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزار ہا ہندو اور سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، فوج نے تعزیتی بگل بجائے، ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں نے بیک زبان اللہ کے ایک اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کا اقرار کیا۔

مولانا احمد سعیدؒ نے لحد میں اتارا۔کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔مسلمانوں اور نامسلمانوں میں غم کی یکسانی کے باوجود دکھ کا فرق تھا۔مسلمانوں کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا، ''اب کیا ہوگا؟ ہماری آخری امید بھی ٹوٹ گئی مولانا دفن نہیں ہو رہے، ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان دفن ہو رہے ہیں''۔ (آغا شورشؒ: ص:۹۳/۹۴)

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہیں آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تیری جدائی میں مرنے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
کئی دماغوں کا ایک انسان میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے؟
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے زبان سے زور بیان گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا کارواں گیا ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

(آغا شورش مرحوم: ص:۲۲۸)

جی تو چاہتا ہے کہ مولانا آزادؒ کی شخصیت اور مناقب کا ایک دفتر نقل کر دوں، پر طوالت کا خوف مانع ہے۔

قارئین گہری نظر سے مذکورہ بالا سطور کو از سر نو پڑھیں اور انصاف سے بتائیں، کیا کوئی مےنوش بھی ایسے ایسے اوصافِ حمیدہ سے موصوف ہوسکتا ہے؟؟؟۔

حقیقت کس طرح اہلِ جہاں کے سامنے آئے
حقیقت کو تو افسانہ بنا رکھا ہے دنیا نے

(زکی زکائی)

موسم گرما کی تعطیلات اور چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس

مولانا محمد اشرف ہارون
استاذِ جامعہ بنوری ٹاؤن

کسی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کے بچے اور نوجوان ہوتے ہیں، اس لئے کہ یہی آگے چل کر مستقبل کے معمار بنیں گے، چنانچہ اسی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام نے والدین کے اوپر خصوصاً ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت بچپن ہی سے اس ڈھنگ سے کریں کہ ان کے رگ وریشہ میں دین اسلام کی روح اور اسلامی جذبات وکیفیات سرایت کر جائیں۔

یاد رکھئے! بچپن اور ابتداءِ جوانی یہ انسانی زندگی کے انتہائی تربیتی ادوار ہیں، اگر ان میں خدانخواستہ صحیح دینی واخلاقی تربیت نہ ہو تو پھر مستقبل میں نہ صرف یہ کہ اس غلطی کا تدارک بے حد مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ اس کے انتہائی بھیانک نتائج واثرات بھی معاشرے پر مرتب ہوتے نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم اور احادیثِ مقدسہ میں بچوں کو بنیادی ضروری عقائد، احکام ومسائل کی تعلیم دینے اور ان کے مطابق عمل کرانے کی محنت وجدوجہد کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے، بلکہ بطورِ نمونہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اولاد کے بارے میں دینی فکر کے واقعات کو بھی صراحۃً بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ''۔(التحریم:۶)

ترجمہ:''اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں''۔

ایک روایت میں ہے کہ:

''جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آ گئی کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکام الٰہیہ کی پابندی کریں، مگر اہل وعیال کو ہم کس

طرح جہنم سے بچائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا طریقہ یہ ہی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے، اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے ان کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم کرو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا''۔(روح المعانی)

حضرات فقہاء کرامؒ نے فرمایا کہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔ (مأخوذ از معارف القرآن، ج:۷،ص:۵۰۲تا۵۰۳)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

''وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ''۔ (مریم:۵۵)

ترجمہ:''اور وہ (حضرت اسماعیل علیہ السلام) اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم کرتے رہتے تھے''۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي''۔ (البقرۃ:۱۳۳)

ترجمہ:''اور جس وقت یعقوب (علیہ السلام) کا آخری وقت آیا اور جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدے کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے بعد (مرنے کے) بعد کس کی پرستش کروگے؟''۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے:

''عن عبداللّٰہ قال: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: کلکم راعٍ وکلکم مسؤل عن رعیّتہ''۔ (بخاری،ج:۲،ص:۷۷۹)

ترجمہ:''یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر شخص راعی (ذمہ دار، نگہبان) ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا''۔

مندرجہ بالا آیات اور احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اولاد کی دینی واخلاقی تربیت کرنا والدین کی اہم ذمہ داری ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ بچے یا نوجوان اگر تربیت سے عاری ہوں گے تو بلاشبہ وہ فسق وفجور، الحاد وگمراہی میں پروان چڑھیں گے اور نفس امارہ کی خواہشات اور شیطانی وساوس کے پیچھے چلیں گے، جس کی وجہ سے دنیا وآخرت کے خسارے میں مبتلا ہوجائیں گے، لہٰذا والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔

آپ بخوبی واقف ہیں کہ موسم گرما کی تعطیلات کا عنقریب آغاز ہونے والا ہے، یہ تعطیلات جس طرح بچوں کی دینی واخلاقی ترقیوں کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں، اسی طرح غلط نہج اور

برے رخ پر لے جانے کا سبب بھی ہوسکتی ہیں، چنانچہ اگر موسم گرما کی ان طویل تعطیلات میں بچوں اور نوجوانوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا تو قوی خطرہ ہے کہ یہ اپنے قیمتی اوقات کو روڈوں، انٹرنیٹ کیفوں یا برے دوستوں کی صحبت میں گزار کر دینی، اخلاقی اور عملی اعتبار سے انتہائی پستی کی طرف چلے جائیں گے، اس لئے ان تعطیلات میں والدین کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ ان کی کڑی نگرانی کریں اور ان کے اوقات کو غلط کاموں اور فضولیات میں ضائع ہونے سے بچائیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ ان کے لئے کسی عمدہ دینی مشغلہ کا انتخاب کریں۔

نیز ان تعطیلات میں امت کے علماء، مبلغین اور خصوصاً ائمہ مساجد کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، کیونکہ بلاشبہ محلّہ کے بچے ان ائمہ کی رعیت میں داخل ہیں اور وہ ان کے بارے میں عنداللہ مسؤل ہیں، اسی ضرورت کے پیش نظر گرمیوں کی تعطیلات میں اسکول وکالج کے طلباً کے لئے تربیتی سلسلہ قائم کرنے کے لئے کچھ عرصہ قبل ہماری جامعہ (جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن) کے اساتذۂ کرام نے کافی غور وخوض اور انتہائی جدوجہد کے بعد ایک چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس ''تعلیم وتربیت'' کے نام سے مرتب کیا ہے جو الحمدللہ گزشتہ چند برسوں سے کراچی کے علاوہ ملک کے کئی شہروں کی مساجد میں باقاعدہ اہتمام سے پڑھایا جارہا ہے اور اس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں میں غیر معمولی اور بے مثال تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اس لئے کہ اس کورس میں مسلمان کی بنیادی نظریاتی وعملی ضرورتوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور اندازِ بیان عام فہم اور رواں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح منتخب مضامین کے انتخاب کی مرکزی سوچ بھی رکھی گئی ہے کہ ایک مسلمان بچہ قرآن وسنت اور احکامِ شریعت سے بنیادی ضروری مناسبت کا حامل بن سکے، مثلاً منتخب قرآنی آیات مع ترجمہ وتفسیر، اور پھر ان کے تحت مختصراً اسلامی آداب وشرعی احکام، منتخب احادیثِ مقدسہ مع ترجمہ وتفسیر، اسلام کے بنیادی ارکان، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا تعارف اور ان کے بنیادی احکام ومسائل، سیرت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) اور عربی زبان کا شوق پیدا کرنے کے لئے عربی جملے انگریزی ترجمہ کے ساتھ اور دیگر تربیت واصلاحی مضامین وغیرہ۔

الغرض یہ کورس جس طرح بنیادی عقائد واحکام سکھانے کا بہترین ذریعہ ہے، اسی طرح والدین کی طرف سے بچوں اور نوجوانوں کے لئے موسم گرما کی تعطیلات کو قیمتی بنانے کا بہترین سبب بھی ہے۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے اساتذۂ کرام کی طرف سے اس کورس کا آغاز درحقیقت ایک ''دعوتِ فکر'' ہے اور قوم کے نوجوانوں اور بچوں کی دینی واخلاقی تربیت کے لئے مثالی زینہ بھی ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو مسجد کا دینی ماحول فراہم کرنا ہے اور ان طلبہ کی اسلامی تعلیمات سے ایک گونہ وابستگی پیدا کرنا ہے۔

ہمارے اساتذہ کرام اس عظیم دینی خیرخواہی کے جذبہ کے تحت علماء کرام، ائمہ مساجد اور خصوصاً سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس فکر سامی اور کارخیر کو آگے بڑھانے میں اور اپنے بچوں کے

مستقبل کو دینی رُخ دینے میں بھرپور کوشش کریں گے، ان شاء اللہ! اس سے بچے نیک سیرت، باکردار اور شریف وخلیق بن کر آپ کے لئے صدقۂ جاریہ ہوں گے۔

جو حضرات جامعہ کے اساتذہ کا مرتب کردہ کورس پڑھانا چاہیں وہ یہ ''کورس'' جامعہ کے شعبہ ''مجلس دعوت وتحقیقِ اسلامی علامہ بنوری ٹاؤن کراچی'' سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ضروری اعلان

بابت داخلہ شعبۂ طالبات

وفاق المدارس والجامعات الاسلامیہ پاکستان کے حالیہ فیصلے کے مطابق درس نظامی پڑھنے والی طالبات کے لیے نصاب اور دورانیہ، سابقہ ترتیب سے تبدیل ہو کر ۶ر سالہ ہو چکا ہے، جس کا باضابطہ اطلاق نئے تعلیمی سال شوال ۱۴۳۳ھ سے ہوگا۔

طالبات کے لیے مجوزہ نصاب، ۶ر سالہ دورانیہ اور طالبات کے معروضی احوال پر جامعہ کی مجلس شوری نے بنظر غائر غور وفکر کیا اور مجلس شوریٰ میں یہ طے قرار پایا ہے کہ طالبات کے لیے مجوزہ نصاب اور ۶ر سالہ دورانیہ کو اپنے ہاں نافذ العمل بنانے میں ہمیں کئی پہلوؤں سے دشواریاں اور پیچیدگیاں محسوس ہو رہی ہیں، اس لیے ہم وفاق المدارس کے مجوزہ نصاب اور ۶ر سالہ دورانیہ کے ساتھ اپنے ادارے میں شعبہ بنات کا تعلیمی سلسلہ قائم رکھنے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا شوال المکرم ۱۴۳۳ھ سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے شعبہ بنات میں نئے داخلوں کے لیے صرف وہی طالبات رجوع کریں جو سابقہ ۴ر سالہ نصاب، غیر وفاقی رہ کر پڑھنا چاہتی ہوں،

واضح رہے کہ نئے تعلیمی سال شوال المکرم ۱۴۳۳ھ، مرحلہ ثانویہ عامہ میں نئی آنے والی طالبات کو وفاق المدارس کی مجوزہ ترتیب کے مطابق امتحان دلانے سے ہم قاصر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

از

دفتر تعلیمات

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ماہِ رجب میں ہونے والی بدعات

ایک تحقیقی جائزہ

مفتی محمد راشد ڈسکوی
اُستاذ جامعہ فاروقیہ، کراچی

رتبے کے اعتبار سے عبادات کی دو قسمیں:

کتبِ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جتنی بھی عبادات سرانجام دیتا ہے، ان کی اللہ رب العزت کے ہاں مرتبے کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں، ایک: جو مکان کے بدلنے کے ساتھ مرتبے کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہیں، دوسری: جو زمانے کے بدلنے سے مرتبے کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہیں:

پہلی قسم کی مثال

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی شخص کا اپنے گھر میں اکیلے نماز ادا کرنا ایک نماز کے برابر اجر رکھتا ہے اور محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنا پچیس نمازوں کے برابر اجر رکھتا ہے اور جامع مسجد میں نماز ادا کرنا پانچ سو نمازوں کے برابر اجر رکھتا ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنا پچیس ہزار نمازوں کے برابر اجر رکھتا ہے اور مسجد حرام میں نماز ادا کرنا ایک لاکھ نمازوں کے برابر اجر رکھتا ہے اور مسجد نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنا پچاس ہزار نمازوں کے برابر اجر رکھتا ہے''۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۷۰۰۸، دار الحرمین، بیروت)

اسی طرح حضرت سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جو شخص اپنے گھر میں وضو کر کے مسجدِ قباء میں آئے اور وہاں نماز ادا کرے تو اس کے لئے ایک عمرہ ادا کرنے کے برابر اجر لکھا جاتا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الصلاۃ فی مسجد قباء، رقم الحدیث: ۱۴۱۲، دار احیاء الکتب العربیہ)۔

ان دونوں مثالوں میں دیکھیں کہ مکان بدلا، جگہ بدلی تو عبادت کی قیمت بھی بدلتی

گئی، ایک ہی نماز ہے، لیکن اس کا اجر، جگہ کے بدلنے سے کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

دوسری قسم کی مثال

ایک شخص کسی بھی عام دن میں روزہ رکھے تو اسے ایک روزنے کا اجر ملے گا، لیکن رمضان کا ایک روزہ اتنا اجر رکھتا ہے کہ ساری زندگی روزے رکھنے کا اتنا اجر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کچھ دوسرے ایام ہیں جن میں روزے کا اجر بدلتا جاتا ہے، مثلاً: حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرم ﷺ سے ۹ ذی الحجہ کے دن روزہ رکھنے کے اجر کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اس ایک دن کا روزہ رکھنا اس شخص کے گزرے ہوئے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث:۱۱۶۲، بیت الافکار)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس دن کا روزہ موجودہ گذرنے والے سال اور آنے والے سال کے (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''۔ (المعجم الکبیر: ۵۰۸۹، مکتبۃ العلوم والحکم)۔ ''اسی طرح ۹ اور ۱۰ محرم کا روزہ بھی ایک سال گذشتہ کے (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم:۱۱۶۲، بیت الافکار)

اس کے علاوہ کسی بھی نفل عمل کے بارے میں دیکھیں کہ عام دنوں میں اس کا ایک ہی اجر ہے، لیکن یہی نفل عمل رمضان المبارک میں فرائض کے برابر حصول اجر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ دن میں ادا کی گئی نفل نماز اور رات کے وقت ادا کی گئی نفل نماز (نمازِ تہجد) کے اجر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نمازِ تہجد کو حدیثِ پاک میں "افضل الصلاة بعد الفريضة" کہا گیا ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۱۶۳، بیت الافکار)، اور پھر صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ عام راتوں میں ادا کی گئی نفل نمازیں ایک طرف اور لیلۃ القدر کی ایک رات میں ادا کی گئی نفل نماز دوسری طرف، دونوں کے اجر میں شرق وغرب کا فرق ہے، اس کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ: "ليلة القدر خير من ألف شهر"۔

مندرجہ بالا مثالوں سے بخوبی واضح ہو چکا ہوگا کہ زمانے کے بدلنے سے اللہ کے ہاں عبادات کا بھی رتبہ بدل جاتا ہے، لیکن اس جگہ ایک بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مختلف زمانوں میں جن جن عبادات سے متعلق اجر وثواب کی زیادتی بتلائی گئی ہے، وہ سب کی سب ''منزّل من الله'' ہیں، ان کے اجر وثواب کی زیادتی کی خبر بذریعہ وحی بزبانِ نبوت معلوم ہوئی ہے، انسان خود اپنی چاہت سے، اپنی سوچ سے، کسی خاص دن میں، کسی خاص عبادت کا الگ سے کوئی اجر مقرر نہیں کرسکتا۔

رجب کا مہینہ

چنانچہ سال کے خاص مہینوں میں ایک خاص مہینہ ''رجب المرجب'' بھی ہے، اس مہینے کی سب سے پہلی خصوصیت اس مہینے کا ''اشہر حرم'' میں سے ہونا ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب

ما جاء فی سبع أرضین، رقم الحدیث: ۳۱۹۷، دار طوق النجاۃ)۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ملتِ ابراہیمی میں یہ چار مہینے ادب واحترام کے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کو برقرار رکھا اور مشرکینِ عرب نے جو اس میں تحریف کی تھی اس کی نفی فرمادی''۔ (معارف القرآن للکاندھلوی: ۳/۴۳۱، بحوالہ حاشیہ سنن ابن ماجہ، ص: ۱۲۵)

رجب کی پہلی رات

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب نبی اکرم ﷺ رجب کے مہینہ کا چاند دیکھتے تو یہ دعا فرمایا کرتے تھے: "اللّٰهم بارك لنا في رَجَب وشعبان و بلِّغنا رمَضان'' (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجمعہ، الفصل الثالث، رقم الحدیث: ۱۳۶۹، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: ''اے اللہ! ہمارے لئے رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما، اور ہمیں رمضان کے مہینے تک پہنچادے''۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

''یعنی ان مہینوں میں ہماری طاعت وعبادت میں برکت عطا فرما، اور ہماری عمر لمبی کر کے رمضان تک پہنچا، تاکہ رمضان کے اعمال روزہ اور تراویح وغیرہ کی سعادت حاصل کریں''۔

(مرقاۃ المفاتیح: ۳/۴۱۸، دار الکتب العلمیہ)

ماہِ رجب کے چاند کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ دعا فرماتے تھے، اسی کے ساتھ بعض روایات سے اس رات میں قبولیتِ دعا کا بھی پتہ چلتا ہے، جیسا کہ ''مصنف عبد الرزاق'' میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''پانچ راتیں ایسی ہیں جن میں دعا رد نہیں کی جاتی، وہ شبِ جمعہ، رجَب کی پہلی رات، شعبان کی پندرہویں رات، عید الفطر کی رات اور عید الاضحیٰ کی رات ہے''۔ (مصنف عبد الرزاق، رقم الحدیث: ۷۹۲۷، ۴/۳۱۷، المجلس العلمی)

ماہِ رجب میں روزے

رجب میں روزے رکھنے سے متعلق الگ سے کوئی خاص فضائل منقول نہیں ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک کتاب "تبيين العجب بما ورد في فضل رجب''، لکھی، جس میں انہوں نے بہت سی اُن احادیث کو جمع کر کے ان کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا، جو فضائل رجب سے متعلق نہایت ضعیف یا موضوع تھیں، آپؒ نے فرمایا کہ: ماہِ رجب میں خاص رجب کی وجہ سے کسی روزے کی مخصوص فضیلت صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہے، (تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب، مقدمہ، ص: ۱۱)

البتہ روزہ خود ایک نیک عمل ہے اور پھر رجب کا ''اشھرِ حرم'' میں سے ہونا، تو یہ دونوں مل کے عام دنوں سے زائد حصول اجر کا باعث بن جاتے ہیں، لہذا اس مہینے میں کسی بھی دن کسی خاص متعین اجر کے اعتقاد کے بغیر روزہ رکھنا یقیناً مستحب اور حصولِ خیر کا ذریعہ ہوگا۔ مولانا اشرف

علی تھانویؒ نے (امداد الفتاویٰ:۲/۸۵ میں) ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: ''.......... دوسری حیثیت رجب میں صرف ''شہرحرام'' ہونے کی ہے، جو اس (رجب) میں اور بقیہ اشہرِ حُرم میں مشترک ہے، پہلی حیثیت سے قطع نظر صرف اس دوسری حیثیت سے اس میں روزہ رکھنے کو مندوب فرمایا گیا''۔ چنانچہ کسی دن کو خاص کر کے روزہ رکھنے اور اس کے بارے میں عجیب و غریب فضائل بیان کرنے کی مثال ۲۷ رجب کا روزہ ہے، جو عوام الناس میں ''ہزاری روزہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ (اس پر تفصیلی کلام آگے آرہا ہے)

ماہِ رجب کی بدعات

اسلام سے قبل ہی سے ماہِ رجب میں بہت سی رسومات اور منکرات رائج تھیں، جن کو اسلام نے یکسر ختم کر کے رکھ دیا، ان میں رجب کے مہینے میں قربانی کا اہتمام، جس کو قرآن پاک کی اصطلاح میں ''عتیرہ'' کے نام سے واضح کیا گیا ہے، اسی مہینے میں زکوٰۃ کی ادائیگی اور پھر موجودہ زمانے میں ان کے علاوہ بی بی فاطمہؓ کی کہانی، ۲۲ رجب کے کونڈوں کی رسم، ۲۷ رجب کی شب ''جشنِ شبِ معراج'' اور اگلے دن کا روزہ جس کو ''ہزاری روزہ'' کہا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب ایسی رسومات و بدعات ہیں جن کا شرع شریف میں کوئی ثبوت نہیں ہے، ذیل میں ۲۷ رجب سے متعلق ہونے والی منکرات اور ہزاری روزے سے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

ستائیسویں رجب، شبِ معراج

رجب کی ستائیسویں شب میں موجودہ زمانے میں طرح طرح کی خرافات پائی جاتی ہیں، اس رات حلوہ پکانا، رنگین جھنڈیاں، آتش بازی اور مٹی کے چراغوں کو جلا کے گھروں کے در و دیوار پر رکھنا وغیرہ وغیرہ، جن کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر تو اِن کو عبادت اور ثواب سمجھ کے کیا جاتا ہے تو یہ بدعت کہلائیں گی، کیونکہ نہ تو اِن سب اُمور کو ہمارے نبی کریم ﷺ نے بنفسِ نفیس کیا، نہ ان کے کرنے کا حکم کیا اور نہ ہی آپ ﷺ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا، اور نہ ہی کرنے کا حکم کیا۔ اور اگر ان اُمور کو عبادت سمجھ کے نہیں کیا جاتا، بلکہ بطورِ رسم کیا جاتا ہے تو ان میں فضول خرچی، اسراف اور آتش بازی کی صورت میں جانی نقصان کا خدشہ، سب اُمور شرعاً حرام ہیں۔

اِن تمام اُمور کو اِس بنیاد پر سرانجام دیا جاتا ہے کہ ۲۷ویں رجب میں نبی کریم ﷺ کو سفرِ معراج کروایا گیا، عوام کے اس رات اِس اہتمام سے پتہ چلتا ہے کہ رجب کی ستائیسویں شب کو ہی حتمی اور قطعی طور پر شبِ معراج سمجھا جاتا ہے، حالانکہ آپ ﷺ کو سفرِ معراج کب کروایا گیا؟ اِس بارے میں تاریخ، مہینے، بلکہ سال میں بھی بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، جس کی بنا پر ستائیسویں شب کو ہی شبِ معراج قرار دینا یکسر غلط ہے، اگرچہ مشہور قول یہی ہے۔

دوسری بات! شبِ معراج جس رات یا مہینے میں بھی ہو، اُس رات میں کسی قسم کی بھی

متعین عبادت شریعت میں منقول نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ اِس رات میں سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کو بہت بڑا شرف بخشا گیا، آپ ﷺ کے ساتھ بڑے اعزاز واکرام والا معاملہ کیا گیا اور آپ ﷺ کو آسمانوں پر بُلا کے بہت سے ہدیے دئے گئے، لیکن امت کے لئے اس بارے میں کسی قسم کی کوئی فضیلت والی بات کسی نے نقل نہیں کی۔

شبِ معراج افضل ہے یا شبِ قدر؟

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اِن دونوں راتوں (شبِ قدر اور شبِ معراج) میں سے کون سی رات افضل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ کے حق میں لیلۃ المعراج افضل ہے اور امت کے حق میں لیلۃ القدر، اس لئے کہ اِس رات میں جن انعامات سے نبی اکرم ﷺ کو مختص کیا گیا، وہ ان (انعامات) سے کہیں بڑھ کے ہیں جو (انعامات آپ ﷺ کو) شبِ قدر میں نصیب ہوئے، اور امت کو جو حصہ (انعامات کا) شبِ قدر میں نصیب ہوا، وہ اس سے کامل ہے جو (امت کو شبِ معراج میں) حاصل ہوا، اگر چہ امتیوں کے لئے شبِ معراج میں بھی بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن اصل فضل، شرف اور اعلیٰ مرتبہ اُس ہستی کے لئے ہے جس کو معراج کروائی گئی، صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مجموع الفتاویٰ، کتاب الفقہ، کتاب الصیام، رقم الحدیث: ۲۳۷، ۲۵/۱۳۰، دارالوفاء)

علامہ ابن قیم الجوزیہؒ نے بھی اسی قسم کا ایک لمبا سوال و جواب ابن تیمیہؒ کا نقل کیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ''اِس جیسے اُمور میں کلام کرنے کے لئے قطعی حقائق کی ضرورت ہوتی ہے اور اِن کا علم ''وحی کے بغیر ممکن نہیں'' اور اِس معاملے میں کسی تعیین کے بارے میں وحی خاموش ہے، لہذا بغیر علم کے اِس بارے میں کلام کرنا جائز نہیں ہے''۔

(زادالمعاد، التفاضل بین لیلۃ القدر ولیلۃ الاسراء: ۱/۵۷، ۵۸، مؤسسۃ الرسالۃ)

چنانچہ! جب اتنی بات متعین ہوگئی کہ امت کے حق میں شبِ معراج کی کوئی فضیلت منصوص نہیں ہے، علاوہ اس بات کے کہ اس رات کا ۲۷ رجب کو ہی ہونا بھی قطعی نہیں ہے تو اِس رات کو یا اِس کے دن کو کسی عبادت کے لئے جداگانہ طور پر متعین کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اب ذیل میں شبِ معراج کے وقتِ وقوع کے بارے میں جمہور علماء کی تحقیق پیش کی جائے گی:

واقعہ معراج کب پیش آیا؟

علماءِ سیر کا اس مین اختلاف ہے کہ آپ ﷺ کو معراج کب کروائی گئی، اس بارے میں (یعنی جس سال میں معراج کروائی گئی) عموماً دس اقوال ملتے ہیں: اکثر علماء کے نزدیک اتنی بات تو متعین ہے کہ واقعہ معراج ''بعثت'' کے بعد پیش آیا، البتہ بعثت کے بعد کے زمانے میں اختلاف ہے، چنانچہ ا:......ابن سعدؒ کا قول ہے کہ معراج ہجرت سے ایک سال قبل کروائی گئی۔۲:......ابن جوزیؒ کا قول ہے کہ معراج ہجرت سے آٹھ ماہ قبل ہوئی۔۳:......ابو الربیع بن سالمؒ کا کہنا ہے کہ

ہجرت سے چھ ماہ قبل ہوئی۔۴:...... ابراہیم الحربیؒ کا کہنا ہے کہ ہجرت سے گیارہ ماہ قبل ہوئی۔ ۵:...... ابن عبد البرؒ کی رائے ہجرت سے ایک سال اور دو ماہ قبل کی ہے۔ ۶:...... ابن فارسؒ کی رائے ہجرت سے ایک سال اور تین ماہ قبل کی ہے۔ ۷:...... سدّیؒ نے ہجرت سے ایک سال اور پانچ ماہ قبل کا قول نقل کیا ہے۔ ۸:...... ابن الأثیرؒ نے ہجرت سے تین سال قبل کا قول اختیار کیا ہے۔ ۹:...... زہریؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے پانچ سال قبل پیش آیا۔ ۱۰:...... ایک قول بعثت سے پہلے وقوعِ معراج کا بھی ہے، لیکن یہ قول شاذ ہے، اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

اِن اقوال میں سب سے زیادہ مشہور قول جس کو ترجیح دی گئی ہے، وہ ہجرت سے ایک سال قبل کا ہے۔ (فتح الباری: ۷/۲۵۴، دار السلام، سبل الہدیٰ والرشاد: ۳/۶۵، دار الکتب العلمیۃ)

معراج کس مہینے میں ہوئی؟

جس طرح وقوعِ معراج کے سال میں اختلاف ہے، اسی طرح مہینے کی تعیین میں اختلاف ہے کہ واقعہ معراج کس مہینے میں پیش آیا؟ اس بارے میں بعض جگہ پانچ مہینوں کا ذکر مختلف اقوال میں ملتا ہے اور بعض جگہ چھ مہینوں کا۔

۱:...... بہت سارے علماء کے نزدیک ربیع الاول کے مہینے میں واقعہ معراج پیش آیا۔

۲:...... ابراہیم بن اسحاق الحربیؒ نے ربیع الاخر کے مہینے میں معراج کا ہونا لکھا ہے۔

۳:...... عبدالغنی بن سرور المقدسیؒ نے رجب کے مہینے کو ترجیح دی ہے، یہی قول مشہور بھی ہے۔

۴:...... سدّیؒ نے شوّال میں معراج کا ہونا لکھا ہے۔

۵:...... ابن فارسؒ نے ذوالحجہ میں معراج کا ہونا لکھا ہے، (شرح المواہب للزرقانیؒ: ۲/۷۰، دار الکتب العلمیۃ، عمدۃ القاری: ۱۷/۲۷، دار الکتب العلمیۃ)

معراج کس رات میں ہوئی؟

علامہ زرقانیؒ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں: پہلا قول جمعے کی رات کا ہے۔ دوسرا قول ہفتہ کی رات اور تیسرا قول پیر کی رات کا ہے۔ چونکہ معراج کی تاریخ میں سخت اختلاف ہے، اس لئے رات کی تعیین میں حتمی قول اختیار کرنا آسان نہیں ہے۔

(سُبُل الہدیٰ والرشاد: ۳/۶۵، دار الکتب العلمیہ)

تعیینِ شبِ معراج میں اتنا اختلاف کیوں؟

علماءِ سیر نے خوب تحقیق کے بعد اُن صحابہؓ کی تعداد اور نام لکھے ہیں، جنہوں نے قصۂ معراج کو نقل کیا، کسی نے مختصر اور کسی نے تفصیل سے، چنانچہ علامہ قسطلانیؒ نے (المواہب اللدنیہ: ۲/۳۴۵، میں) چھبیس صحابہؓ کے نام شمار کئے ہیں، اور علامہ زرقانیؒ نے اس کتاب کی شرح میں ان

صحابہ کے ناموں میں اضافہ کرتے ہوئے پینتالیس کی تعداد اور ان کے نام ذکر کئے ہیں۔
(شرح العلامۃ الزرقانی: ۷۶/۸، دارالکتب العلمیۃ)

اس تفصیل کے بعد قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس قصے کی تفصیل بیان کرنے والے اصحابؓ رسول کی اتنی بڑی تعداد ہے اور اس کے باوجود جس رات میں یہ واقعہ پیش آیا اس رات کی حتمی تاریخ کسی نے بھی نقل نہیں کی، آخر کیوں؟ کتبِ سیر میں غور کرنے کے بعد سوائے اس کے کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر چہ اس رات میں اتنا بڑا واقعہ پیش آیا، لیکن اس کی بنا پر اس رات کو کسی مخصوص عبادت کے لئے متعین کرنا نہ تو کسی کو سُوجھا اور نہ ہی زبانِ نبوت سے اس بارے میں کوئی حکم صادر ہوا، اور نہ ہی اس رات کی اس طرح سے تعظیم کسی صحابیِ رسول کے ذہن میں پیدا ہوئی، لیکن اس کے باوجود یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر چہ اس سے کوئی حکم شرعی وابستہ نہیں تھا، تاہم بمقتضائے محبت ہی اس طرف توجہ کی جاتی، جب حضورِ اکرم ﷺ کے خدوخال اور نقش و نگار کو بھی بمقتضائے محبت ضبط کرنے کا اہتمام کیا گیا تو آخر اس شب سے اس قدر بے اعتنائی کی کیا وجہ؟ تو اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

> ''کہ اس شب میں خرافات و بدعات کی بھرمار کا شدید خطرہ تھا، حضور ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سدّ باب کی غرض سے اس کو مبہم رکھنا ہی ضروری سمجھا''۔ (سات مسائل، ص: ۱۶، دارالافتاء والارشاد، کراچی)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا عشقِ رسول ﷺ

کیا کسی بھی درجے میں یہ بات سوچی جاسکتی ہے کہ العیاذ باللہ! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم و نبی اکرم ﷺ سے عشق و محبت نہ تھی، یا اُن کو اس رات میں نبی اکرم ﷺ کو ملنے والے اتنے بڑے اعزاز کی خوشی نہیں ہوئی، ہرگز نہیں! اُن سے بڑا عاشقِ رسول کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اُن کا عشق حقیقی تھا، جس کی بنا پر اُن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو ہی نہیں سکتا تھا، جو سرکارِ دو عالم ﷺ کی منشأ کے خلاف ہوتا، وہ تو خیر کے کاموں کی طرف بہت تیزی سے لپکنے والے تھے، لہٰذا اگر اس رات میں کوئی مخصوص عبادت ہوتی تو وہ ضرور اسے سرانجام دیتے اور اسے امت تک بھی پہنچاتے، لیکن ایسا کوئی بھی اقدام صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی تاریخ میں نہیں ملتا، تو جب کوئی خیر کا کام ان کو نہیں سُوجھا تو وہ ''خیر'' ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ بدعت ہوگا، جیسا کہ علامہ شاطبیؒ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"کل عبادة لم يتعبدها أصحاب رسول الله ﷺ فلا تعبدوها". (الاعتصام للشاطبیؒ، باب فی فرق البدع و المصالح المرسلة: ۱/۱۴۱، دارالمعرفة).

ترجمہ: ''ہر وہ عبادت جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا، سو تم بھی اُسے مت کرو''۔

بدعت کی پہچان کے لئے معیار

"وأما أهل السنة والجماعة فيقولون في كل فعلٍ و قولٍ لم يثبُت عن الصحابة، هو بدعةٌ لأنه لو كان خيراً سبقونا إليه، إنهم لم يتركوا خصلةً من خصالِ خير إلا و قد بادَروا إليها" (تفسیر ابن کثیر، الأحقاف: ۱۱، دارالسلام)۔

ترجمہ: ''اہل سنت والجماعت یہ فرماتے ہیں کہ جو فعل حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا بدعت ہے، کیونکہ اگر وہ اچھا کام ہوتا تو ضرور حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم ہم سے پہلے اُس کام کو کرتے، اس لئے کہ انہوں نے کسی نیک اور عمدہ خصلت کو تشنۂ عمل نہیں چھوڑا، بلکہ وہ ہر (نیک) کام میں سبقت لے گئے''۔

اصلاحی خطبات سے ایک اقتباس

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہ فرماتے ہیں کہ: ''۲۷ رجب کی شب کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ یہ شبِ معراج ہے، اوراس شب کو بھی اسی طرح گذارنا چاہئے جس طرح شب قدر گذاری جاتی ہے اور جو فضیلت شب قدر کی ہے، کم وبیش شب معراج کی بھی وہی فضیلت سمجھی جاتی ہے، بلکہ میں نے تو ایک جگہ یہ لکھا ہوا دیکھا کہ ''شبِ معراج کی فضیلت شبِ قدر سے بھی زیادہ ہے'' اور پھر اس رات میں لوگوں نے نمازوں کے بھی خاص خاص طریقے مشہور کر دیئے کہ اس رات میں اتنی رکعات پڑھی جائیں اور ہر رکعت میں فلاں فلاں سورتیں پڑھی جائیں، خدا جانے کیا کیا تفصیلات اس نماز کے بارے میں مشہور ہوگئیں، خوب سمجھ لیجئے: یہ سب بے اصل باتیں ہیں، شریعت میں ان کی کوئی اصل اور کوئی بنیاد نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ۲۷ رجب کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی رات ہے جس میں نبی کریم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے، کیونکہ اس باب میں مختلف روایتیں ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ربیع الاول کے مہینے میں تشریف لے گئے تھے، بعض روایتوں میں رجب کا ذکر ہے اور بعض روایتوں میں کوئی اور مہینہ بیان کیا گیا ہے، اس لئے پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی رات صحیح معنوں میں معراج کی رات تھی، جس میں آنحضرت ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے، اس سے آپ خود اندازہ کرلیں کہ اگر شب معراج بھی شب قدر کی طرح کوئی مخصوص رات ہوتی، اوراس کے بارے میں کوئی خاص احکام ہوتے جس طرح شب قدر کے بارے میں ہیں تو اس کی تاریخ اور مہینہ محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا، لیکن چونکہ شب معراج کی تاریخ محفوظ نہیں تو اب یقینی طور سے ۲۷ رجب کو شب معراج قرار دینا درست نہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آپ ﷺ ۲۷ رجب کو ہی معراج کے لئے تشریف لے

گئے تھے، جس میں یہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ مقام قرب عطا فرمایا اور اپنی بارگاہ میں حاضری کا شرف بخشا، اور امت کے لئے نمازوں کا تحفہ بھیجا تو بے شک وہی ایک رات بڑی فضیلت والی تھی، کسی مسلمان کو اس کی فضیلت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ فضیلت ہر سال آنے والی ۲۷ رجب کی شب کو حاصل نہیں۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ (بعض روایات کے مطابق) یہ واقعہ معراج سن ۵ نبوی میں پیش آیا، یعنی حضور ﷺ کے نبی بننے کے پانچویں سال یہ شب معراج پیش آئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد ۱۸ سال تک آپ ﷺ نے شب معراج کے بارے میں کوئی خاص حکم دیا ہو، یا اس کو منانے کا حکم دیا ہو، یا اس کو منانے کا اہتمام فرمایا ہو، یا اس کے بارے میں یہ فرمایا ہو کہ اس رات میں شب قدر کی طرح جاگنا زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے، نہ تو آپ ﷺ کا ایسا کوئی ارشاد ثابت ہے، اور نہ آپ ﷺ کے زمانے میں اس رات میں جاگنے کا اہتمام ثابت ہے، نہ خود آپ ﷺ جاگے اور نہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی تاکید فرمائی اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے طور پر اس کا اہتمام فرمایا۔

پھر سرکار دو عالم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد تقریباً سو سال تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا میں موجود رہے، اس پوری صدی میں کوئی ایک واقعہ ثابت نہیں ہے، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ۲۷ رجب کو خاص اہتمام کر کے منایا ہو، لہذا جو چیز حضور اکرم ﷺ نے نہیں کی اور جو چیز آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کی، اس کو دین کا حصہ قرار دینا، یا اس کو سنت قرار دینا یا اس کے ساتھ سنت جیسا معاملہ کرنا بدعت ہے، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں (العیاذ باللہ) حضور ﷺ سے زیادہ جانتا ہوں کہ کونسی رات زیادہ فضیلت والی ہے، یا کوئی شخص یہ کہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ مجھے عبادت کا ذوق ہے، اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عمل نہیں کیا تو میں اس کو کروں گا تو اس کے برابر کوئی احمق نہیں''۔ (اصلاحی خطبات: ۴۸/۱-۵۱، میمن اسلامک پبلشرز)

''حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ دین کو سب سے زیادہ جاننے والے، دین کو خوب سمجھنے والے، اور دین پر مکمل طور پر عمل کرنے والے تھے، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان سے زیادہ دین کو جانتا ہوں، یا ان سے زیادہ دین کا ذوق رکھنے والا ہوں، یا ان سے زیادہ عبادت گذار ہوں تو حقیقت میں وہ شخص پاگل ہے، وہ دین کی فہم نہیں رکھتا۔ لہذا اس رات میں عبادت کے لئے خاص اہتمام کرنا بدعت ہے، یوں تو ہر رات میں اللہ تعالیٰ جس عبادت کی توفیق دے دیں وہ بہتر ہی بہتر ہے، لہذا آج کی رات بھی جاگ لیں، لیکن اس رات میں اور دوسری راتوں میں کوئی فرق اور نمایاں امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔''

(اصلاحی خطبات: ۵۱/۱، ۵۲، میمن اسلامک پبلشرز)

ہزاری روزہ

عوام الناس میں یہ رواج ہے کہ ۲۷ رجب کو روزہ کی بڑی فضیلت مشہور ہے، حتی کہ اس بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس ایک دن کے روزے کا اجر ایک ہزار روزے کے اجر کے برابر ہے، جس کی بنا پر اسے ''ہزاری روزے'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، حالانکہ شریعت میں اس روزے کی مذکورہ فضیلت صحیح روایات میں ثابت نہیں ہے، اس بارے میں اکثر روایات موضوع ہیں اور بعض روایات جو موضوع تو نہیں، لیکن شدید ضعیف ہیں، جس کی بنا پر اس دن کے روزے کے سنت ہونے کے اعتقاد یا اس دن روزے پر زیادہ ثواب ملنے کے اعتقاد پر روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ اس بارے میں اکابرین علماء امت نے امت کے ایمان و اعمال کی حفاظت کی خاطر راہنمائی کرتے ہوئے فتاویٰ صادر فرمائے، جو ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں:

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ ماہِ رجب میں ہونے والی ''رسمِ تبارک'' اور ''رجب کے ہزاری روزے'' کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اِن دونوں امر کا التزام نادرست اور بدعت ہے اور وجوہ اِن کے ناجائز ہونے کی (کتاب) اصلاح الرسول، براہینِ قاطعہ اور اربعہ میں درج ہیں'' (فتاویٰ رشیدیہ، ص:۱۴۸، ادارہ اسلامیات)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''ماہِ رجب میں تواریخ مذکورہ میں روزہ رکھنے کی فضیلت پر بعض روایات وارد ہوئی ہیں، لیکن وہ روایات محدثین کے نزدیک درجۂ صحت کو نہیں پہنچیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "ما ثبت بالسنة" میں ذکر کیا ہے کہ: ''بعض (روایات) بہت ضعیف اور بعض موضوع (من گھڑت) ہیں''۔

(فتاویٰ محمودیہ: ۳/۲۸۱، جامعہ فاروقیہ، کراچی)

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ: ''عوام میں ۲۷ رجب کے متعلق بہت بڑی فضیلت مشہور ہے، مگر وہ غلط ہے، اس فضیلت کا اعتقاد بھی غلط ہے، اِس نیت سے روزہ رکھنا بھی غلط ہے، "ما ثبت بالسنة" میں اِس کی تفصیل موجود ہے۔'' (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۲۰۲، جامعہ فاروقیہ، کراچی)

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ لکھتے ہیں کہ: ''ستائیسویں رجب کے روزے کو جسے عوام

''ہزارہ روزہ'' کہتے ہیں اور ہزار روزوں کے برابر اس کا ثواب سمجھتے ہیں، اس کی کچھ اصل نہیں ہے''۔ (فتاویٰ دار العلوم دیو بند مکمل و مدلل: ۶/۴۰۶، مکتبہ حقانیہ، ملتان)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے

حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ لکھتے ہیں کہ: ''ستائیسویں رجب کے بارے میں جو روایات آئی ہیں، وہ موضوع اور ضعیف ہیں، صحیح اور قابل اعتماد نہیں، لہٰذا ستائیسویں رجب کا روزہ عاشوراء کی طرح مسنون سمجھ کر ہزار روزوں کا ثواب ملے گا، اس اعتقاد سے رکھنا ممنوع ہے''۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۲۷۴، دار الاشاعت، کراچی)

بہشتی زیور میں ہے

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (رجب کے چاند کے بارے میں) لکھتے ہیں کہ: ''اس کو عام لوگ ''مریم روزہ کا چاند'' کہتے ہیں، اور اس کی ستائیس تاریخ میں روزہ رکھنے کو اچھا سمجھتے ہیں کہ ایک ہزار روزوں کا ثواب ملتا ہے، شرع میں اس کی کوئی قوی اصل نہیں، اگر نفل روزہ رکھنے کو دل چاہے اختیار ہے، خدا تعالیٰ جتنا چاہیں ثواب دیدیں، اپنی طرف سے ہزار یا لاکھ مقرر نہ سمجھے، بعضی جگہ اس مہینے میں ''تبارک کی روٹیاں'' پکتی ہیں، یہ بھی گھڑی ہوئی بات ہے، شرع میں اس کا کوئی حکم نہیں، نہ اس پر کوئی ثواب کا وعدہ ہے، اس واسطے ایسے کام کو دین کی بات سمجھنا گناہ ہے''۔
(بہشتی زیور: ۶/۶۰، دار الاشاعت، کراچی)

عمدۃ الفقہ میں ہے

حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہؒ لکھتے ہیں: ''ہزاری روزہ یعنی ستائیس رجب المرجب کا روزہ، عوام میں اس کا بہت ثواب مشہور ہے، بعض احادیثِ موضوعہ (من گھڑت احادیث) میں اس کی فضیلت آئی ہے، لیکن صحیح احادیث اور فقہ کی معتبر کتابوں میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ بعض روایات میں ممانعت آئی ہے، پس اس کو ضروری اور واجب کی مانند سمجھ کر روزہ رکھنا یا ہزار روزہ کے برابر ثواب سمجھ کر رکھنا بدعت و منع ہے''۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۱۹۵، زوار اکیڈمی)

خلاصۂ کلام

مندرجہ بالا تفصیل سے ۲۷ رجب کے روزے کی بے سند و بے بنیاد مشہور ہو جانے والی فضیلت کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن کو خاص فضیلت والا دن سمجھ کر یا خاص عقیدت کے ساتھ مخصوص ثواب کے اعتقاد سے روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔ اللہ رب العزت محض اپنے فضل و کرم سے صحیح نہج پر اپنے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

زبان کی آفتوں کا بیان

مولانا غلام مصطفیٰ صاحب
فاضل ومتخصص جامعہ بنوری ٹاؤن

زبان عظیم نعمت:

زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اس کا حجم اگرچہ مختصر ہے، لیکن اس کی اطاعت بھی زیادہ ہے اور گناہ بھی بڑا ہے۔ ایمان اور کفر دونوں حقیقتوں کا اظہار زبان سے ہوتا ہے۔ زبان ہی ایک ایسا عضو ہے جس کا دائرۂ اختیار بہت وسیع ہے، جس طرح زبان خیر کے میدان میں دوڑ سکتی ہے، اسی طرح شر کے میدان میں بھی اسے کوئی شکست دینے والا نہیں، اس لئے زبان پر قابو رکھنا نہایت ضروری ہے، جو شخص زبان پر قابو نہیں رکھتا، شیطان اس سے نہ جانے کیا کچھ کہلوا لیتا ہے اور اسے بُرے انجام کی طرف لے جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے:

''هل يكب الناسَ في النار على مناخرهم إلا حصائدُ ألسنتهم''۔ (ابن ماجہ، ص:۲۸۶)

ترجمہ:۔''لوگ اپنی زبانوں کا بویا کاٹنے کے لئے ہی دوزخ میں ناک کے بل اوندھے ڈالے جاتے ہیں''۔

زبان کے شر سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اسے شریعت کی لگام پہنائے اور سنت کی زنجیریں ڈال دے اور صرف وہی بات کرے جو دین و دنیا کے لئے مفید ہو اور ہر ایسی بات سے رک جائے جس کی ابتداء یا انتہاء سے برے انجام کی توقع ہو۔ عام طور پر زبان کی آفات سے بچنے میں تساہل برتا جاتا ہے اور اس کے شر کو معمولی سمجھ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ شیطان کا مؤثر ترین ہتھیار ہے۔ جو شخص زبان سے تعلق رکھنے والی آفتوں کی باریکیاں سمجھ لے گا، وہ اس اعتراف پر مجبور ہوگا کہ اس سلسلے میں سرکار دو عالم ﷺ کا یہ فرمان حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے:''من صمت نجا''۔(مشکوٰۃ، ج:۲، ص:۴۱۳) ترجمہ:''جو شخص خاموش رہا اس نے نجات پائی''۔

چنانچہ ذیل میں زبان کی آفتیں تفصیل سے الگ الگ درج کی جاتی ہیں۔

۱:۔لایعنی کلام

بہتر یہ ہے کہ آدمی صرف وہ بات کہے جو جائز ہو اور جس میں نہ ہی بولنے والے کے لئے کوئی ضرر ہو اور نہ کسی دوسرے مسلمان بھائی کے لئے۔ جائز اور ضرر نہ دینے والی بعض باتیں ایسی بھی زبان سے نکل جاتی ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، یہ لایعنی اور بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں، ان میں وقت کا ضیاع بھی ہے اور آخرت کا محاسبہ بھی ہے، کیونکہ متکلم اگر بولنے کے بجائے اللہ کی صفات میں غور وفکر کرتا تو ممکن تھا کہ اللہ اس فکر کے نتیجے میں اس پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھولتا، نیز بولنے کے بجائے اللہ کی تسبیح وتحمید اور تہلیل کر لیتا تو یہ اس کے حق میں زیادہ مفید ہوتا۔ کتنے الفاظ ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ادا ہو تو جنت میں محل تیار ہو جائے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر ترک کر کے کسی لایعنی اور بے فائدہ مگر مباح کام میں مشغول ہو جائے، وہ اگر چہ گنہگار نہیں، مگر یہی نقصان کیا کم ہے کہ اسے نفع عظیم حاصل نہ ہو سکا؟۔

بندہ کا اصل سرمایہ اس کے اوقات ہیں، اگر اوقات لایعنی کاموں میں صرف کئے اور اس سرمایہ کو آخرت کے لئے ذخیرہ نہ رکھا تو سوائے نقصان کے اور کیا ہاتھ لگے گا؟ اسی لئے نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

”**من حسن إسلام المرء تركه ما لايعنيه**“ (مشکوۃ، ج:۲،ص:۴۱۳)

ترجمہ:۔”آدمی کے اسلام کے اچھے ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی کام ترک کر دے“۔

۲:۔زیادہ بولنا

زیادہ بولنا بھی ناپسندیدہ عمل ہے، اس میں بے فائدہ کلام بھی شامل ہے اور وہ کلام بھی جو مفید تو ہو، مگر حدِ ضرورت سے زائد ہو۔ مفید کلام مختصر بھی ہو سکتا ہے، جو شخص اختصار پر قدرت رکھنے کے باوجود ایک لفظ کی جگہ دو لفظ بولے تو یہ کہا جائے گا کہ وہ فضول گو ہے، یہ فضول گوئی بھی ممنوع ہے، اگر چہ اس میں کوئی گناہ یا ضرر نہیں۔ خیر القرون کے دور میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دنیا کی شدید ضرورتوں سے تعلق رکھنے والے کلام کے علاوہ ہر کلام زائد شمار ہوتا تھا۔ انسان کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ نامۂ اعمال میں لکھا جا رہا ہے، قرآن کریم میں ہے:

”مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلاَّ لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ“۔ (ق:۱۸)

ترجمہ:”اور وہ زبان سے کوئی لفظ نہیں نکال پاتا، مگر اس کے پاس ایک تاک لگانے والا تیار ہے“۔

پس اسی شخص کے لئے فضیلت ہے جو زائد باتوں سے زبان کو روکے رکھے۔ حدیث میں ہے:

''طوبیٰ لمن عمل بعلمه وأنفق الفضل من ماله وأمسک الفضل من قوله''۔ (شعب الایمان، ج:۷، ص:۳۲فصل فی فضل السکوت عن کل مالا یعنیہ)

ترجمہ:۔ ''خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جو اپنے علم پر عمل کرے، زائد مال خرچ کرے اور زبان کو زائد کلام سے روکے''۔

لیکن افسوس! آج لوگوں نے عملاً اس حدیث کا مفہوم بدل ڈالا ہے، اب زائد مال جمع کرتے ہیں اور زبان کو زائد کلام سے نہیں روکتے۔

۳:۔ باطل کا تذکرہ

باطل سے وہ کلام مراد ہے جس کا تعلق معاصی سے ہو، مثلاً عورتوں کے حسن و جمال، عشق ومحبت کے قصے، فسق وفجور کا حال وغیرہ بیان کرنا، یہ سب امور باطل ہیں، ان میں مشغول رہنا ناجائز ہے۔ تفریحی گفتگو آج کے دور کا خاص مشغلہ ہے، اکثر مجالسِ عوام کا موضوع باطل ہوتا ہے، کہیں کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے، کسی کے عیوب ظاہر اور کسی کے تلاش کئے جاتے ہیں، کسی کے خلاف سازشیں کی جاتی ہیں، غرض یہ کہ کوئی مجلس معصیت سے خالی نہیں ہوتی۔ باطل امور کا تذکرہ خطرناک آفت ہے، اس آفت کا شکار ہونے والا تباہ وبرباد ہوجاتا ہے، اگرچہ اس تذکرہ کو معمولی سمجھتا ہے اور اس کے خطرات کا احساس نہیں کرتا، مگر روزِ قیامت اس پر یہ انکشاف ہوگا کہ وہ جس معصیت کو معمولی سمجھ رہا تھا، وہ اس کے لئے کتنی تباہی لے کر آئی ہے، حدیث شریف میں ہے:

''إن أحدكم ليتكلم بالكلمة من رضوان الله ما يظن أن تبلغ ما بلغت فيكتب الله له بها رضوانه إلى يوم القيامة، إن أحدكم يتكلم بالكلمة من سخط الله ما يظن أن تبلغ ما بلغت فيكتب الله عليه بها سخطه إلى يوم يلقاه''۔ (ابن ماجہ:۲۸۵)

ترجمہ:۔ ''آدمی اللہ کو خوش کرنے والا ایک کلمہ بولتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے کوئی بڑی خوشنودی حاصل نہیں ہوگی، لیکن اللہ تعالیٰ اس لفظ کی وجہ سے قیامت تک کے لئے اپنی رضامندی لکھ دیتے ہیں۔ کبھی آدمی اللہ کو ناراض کرنے والا ایک لفظ بولتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ زیادہ ناراض نہیں ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس ایک لفظ کی وجہ سے قیامت تک کے لئے اپنی ناراضی لکھ دیتے ہیں''۔

قرآن کریم کی یہ دو آیتیں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتی ہیں: ''وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ''۔ (مدثر:......) ترجمہ: ''ہم تھے بحث کرتے بحث کرنے والوں کے ساتھ''۔

''فَلَاتَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ''۔ (نساء:۱۴۰)

ترجمہ:۔''جب تک وہ لوگ اور باتیں نہ کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو''۔

یہ باطل کلام غیبت، چغل خوری اور بدگوئی سے ایک الگ قسم ہے، باطل کلام ان ممنوعہ امور کا ذکر کرنا ہے جن کا سابق میں وجود ہو چکا ہو اور کوئی دینی ضرورت ان کے ذکر کی باعث نہ ہو، اس میں بدعات اور فاسد مذاہب کی حکایات اور صحابہؓ کے باہمی اختلافات کا ذکر بھی داخل ہے۔

۴:۔ بات کاٹنا اور جھگڑنا

احادیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے بات کاٹنے اور جھگڑنے سے منع فرمایا ہے، سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

''لاتمار أخاک ولاتمازحه ولاتعده موعداً فتخلفه''۔(ترمذی، ج:۲،ص:۲۰)

ترجمہ:۔''اپنے بھائی کی بات مت کاٹ اور نہ اس سے (ناشائستہ) مذاق کر اور نہ اس سے ایسا وعدہ کر جسے تو پورا نہ کرے''۔

دوسری روایت میں ہے:

''من ترک الکذب وهو باطل بُنِی له فی ربض الجنة ومن ترک المراء وهو محق بُنِی له فی وسطها''۔ (سنن ترمذی، ج:۲،ص:۲۰)

ترجمہ:''جو شخص باطل پر ہونے کے باوجود جھوٹ چھوڑ دے، اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جائے گا اور جو شخص حق پر ہوتے ہوئے بحث و جھگڑا ترک کردے، اس کے لئے جنت کے وسط میں گھر بنایا جائے گا''۔

ترمذی شریف میں ہے:

''ماضل قوم بعد هدی کانوا علیه إلا أوتوا الجدل''۔ (ترمذی، ج:۲،ص:۱۶۱)

ترجمہ:''ہدایت سے نوازے جانے کے بعد قومیں جھگڑوں کی وجہ سے گمراہ ہوئیں''۔

کج بحثی اور جھگڑنے کی برائی میں بے شمار روایات اور آثار موجود ہیں۔ جدال اور مراء میں اکثر یہی مقصود ہوتا ہے کہ فریق مخالف کو اس کے کلام میں الفاظ یا معانی کے اعتبار سے نقص نکال کر اس کو خاموش کردیا جائے، اس کی جہالت اور قصور و عجز کا بیان کیا جائے، تاکہ وہ رسوا ہو اور لوگ اس کا مذاق اڑائیں، اگر فریق مخالف کو حق کی خاطر تنبیہ کرنی ہو تو اس کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی بجائے ایسا رویہ اپنانا جس سے اس کی توہین ہو اور اپنی فضیلت کا اظہار ہو، یہ بھی اس میں شامل ہے۔ بہرکیف یہ دونوں عیوب دراصل اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے مخالف کی تحقیر اور اپنی برتری مقصود ہوتی ہے، دوسرے کی تحقیر کا جذبہ اور اپنی برتری کی خواہش خودستائی کی

قبیل سے ہے اور خودستائی اپنے آپ کو بڑا، بلند و اعلیٰ سمجھنے کا ردعمل ہے۔

۵:۔ خصومت

خصومت بھی ایک مذموم صفت ہے، یہ جدال اور مراء سے الگ ہے، اس سے مقصود کسی کے مال یا حق پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ روایات میں خصومت کی مذمت وارد ہے۔ حضرت عائشہؓ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتی ہیں:

''إن أبغض الرجال إلى الله الألد الخصم''۔ (ترمذی، ج:۲، ص:۱۲۱)

ترجمہ: ''اللہ کے نزدیک آدمیوں میں سب سے بُرا شخص وہ ہے جو بہت زیادہ جھگڑالو اور خصومت پسند ہو''۔

شریعت میں اس بات کی اجازت ہے کہ اگر کسی انسان کا دوسرے پر کوئی حق ہو اور وہ اسے دینے پر رضامند نہ ہو تو اس کے حصول کے لئے خصومت کی جاسکتی ہے، لیکن ایسی خصومت جو باطل پر مبنی ہو یا بغیر علم کے کی جائے یہ مذموم ہے، جیسے وکیل یہ جانے بغیر کہ حق کس کی طرف ہے، کسی ایک فریق کی طرف سے لڑا کرتے ہیں، اسی طرح وہ خصومت بھی مذموم ہے جہاں اپنا حق وصول کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ مخالف کو ایذاء پہنچانا اور موذی الفاظ استعمال کئے جائیں، اس کے ذریعہ حریف کی توہین و تذلیل مقصود ہو اور اس کا محرک بغض و عناد ہو۔ جو شخص لڑے بغیر اپنا حق وصول کرسکتا ہے، اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خصومت کا راستہ اختیار نہ کرے، خصومت میں زبان کو حد اعتدال پر قائم رکھنا مشکل ہے، اس سے دلوں میں کینہ پیدا ہوتا ہے اور غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور جب آدمی مشتعل ہو تو اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ شریعت کی پابندی کرے گا۔

یہ درست ہے کہ جو شخص شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ اپنے حق کے لئے خصومت کرتا ہے، وہ گناہ گار نہیں، مگر تارک اولیٰ ضرور ہے۔ خصومت، مراء اور جدال کا ادنیٰ شر یہ ہے کہ آپس میں اچھی طرح بات کرنے کی روایات ختم ہو جاتی ہیں، حالانکہ حسن کلام، حسن معاشرت کا جزء ہے اور قابلِ ثواب عمل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً'' (بقرہ:۸۳)...: ''اور لوگوں سے بات اچھی طرح کہنا''۔ ایک حدیث میں ہے:

''اتقوا النار ولو بشق تمرة فإن لم تجد فبكلمة طيبة''۔ (مسلم، ج:۱، ص:۳۲۷)

ترجمہ: ''آگ سے بچو، اگرچہ چھوارے کا ایک ٹکڑا دے کر، یہ نہ ملے تو کوئی اچھا لفظ بول کر۔

۶:۔ فصاحتِ کلام کے لئے تصنع

خلاف عادت وطبیعت بتکلف اپنے کلام، خطاب یا عام بول چال میں کلام کو سنوارنا، تمہیدات

ومقدمات گھڑنا اور اسے سجع وقافیہ سے آراستہ کرنا شریعت میں مذموم ہے، کثیر روایات میں اس کی مذمت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے: ''أنا وأتقیاء أمتی براءٌ من التکلف''۔ (احیاء العلوم بحوالہ طبرانی)... ''میں اور میری امت کے متقی تکلف سے دور ہیں''۔

اسی طرح ایک جنین (پیٹ کے بچے) کے ضائع ہونے پر جب آپ ﷺ نے بطور تاوان مجرمین سے غلام آزاد کرنے کا کہا تو ایک شخص بولا:

''**کیف ندی من لاصاح ولا أکل ولاشرب ولا استھل ......**''۔

(سنن ابی داؤد، ج:۲، ص:۲۸۲)

ترجمہ:۔ ''ہم ایسے بچے کا خون بہا کیسے دیں؟ جو نہ چیخا، نہ کھایا، نہ پیا اور نہ چلایا، (ایسا خون بہا معاف ہے)''۔

آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: ''جاہلوں جیسی تک بندی کرتے ہو'' آپ ﷺ کو تکلفانہ سجع اور تصنع پسند نہ آیا، لہذا کلام ایسا کرنا چاہئے جو مخاطب کی سمجھ میں آجائے، کلام کا مقصد ہی دوسرے کو سمجھانا ہے۔

۷:... فحش گوئی، سب وشتم

یہ بھی مذموم وممنوع ہے، فحش گوئی وسب وشتم کا منبع خبث باطن ہے۔ نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''**ماکان الفحش فی شئ إلا شانه وماکان الحیاء فی شئ إلا زانه**''۔

(ترمذی، ج:۲، ص:۱۸)

ترجمہ:۔ ''فحش گوئی کسی میں نہیں ہوتی، مگر اسے بدنما بناتی ہے اور حیاء کسی میں نہیں ہوتی، مگر اسے خوشنما بناتی ہے''۔

دوسری حدیث میں ہے:

''**لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولاالبذی**''۔ (ترمذی، ج:۲، ص:۱۸)

ترجمہ:۔ ''عیب لگانے والا، لعنت کرنے والا، فحش کہنے والا اور زبان دراز آدمی مؤمن نہیں ہوتا''۔

قبیح امور کو صریح الفاظ میں ذکر کرنا فحش گوئی ہے، بوقت ضرورت اس طرح کے امور اشاروں اور کنایوں سے بھی بتلائے جاسکتے ہیں، لیکن اس کے بجائے ان کو صریح الفاظ میں بیان کرنا ناپسندیدہ ہے، فحش گوئی کا محرک عادت بھی ہوتی ہے اور اہل فسق کی صحبت بھی، کیونکہ فسق، فجور میں مبتلا لوگوں کو سب وشتم کی عادت ہوتی ہے، جو لوگ ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں وہ بھی اس عادت سے متأثر ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''سباب المؤمن فسوق وقتاله کفر''۔ (بخاری، ج:۲،ص:۸۹۳)

ترجمہ:۔''مؤمن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے''۔

۸:...لعنت کرنا

لعنت کرنا خواہ انسان پر ہو یا حیوان پر یا جمادات پر مذموم ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''لایکون المؤمن لعانا'' یعنی ''مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا''۔ (ترمذی) دوسری روایت میں ہے

''إن اللعانین لایکونون شهداء ولاشفعاء یوم القیامة''. (مسلم، ج:۲،ص:۳۲۳)

ترجمہ:۔''لعنت کرنے والے لوگ قیامت کے دن نہ گواہ ہوں گے، نہ سفارشی''۔

لعنت کے معنی ہیں اللہ کی رحمت سے ہٹانا اور دور کرنا۔ جن لوگوں پر لعنت شرع سے ثابت ہے ان کا نام لے کر لعنت کرنے میں کوئی حرج نہیں، مثلاً فرعون، ہامان، ابوجہل ...... کیونکہ شریعت سے ثابت ہے کہ یہ کفر پر ہی مرے تھے، لیکن کسی زندہ معیّن شخص کو ملعون کہنا، اگر چہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو، درست نہیں، کیونکہ ممکن ہے اللہ اسے توبہ کی توفیق دے دے اور وہ اللہ کی قربت پا کر مرے۔ آدمی کے احوال ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے، کیا معلوم کس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ بات تو صرف آنحضرت ﷺ وحی کے ذریعہ جان سکتے تھے۔ جن لوگوں کے انجام سے آپ ﷺ باخبر تھے ان کا نام لے کر لعنت کرنا حدیث سے ثابت ہے، مثلاً ایک روایت میں یہ بددعا ہے:

''اللّٰهم علیک بأبی جهل بن هشام وعتبة بن ربیعة''۔ (مسلم، ج:۲،ص:۱۰۸)

ترجمہ:۔''اے اللہ! ابوجہل بن ہشام اور عتبہ بن ربیعہ کو اپنے قہر میں جکڑ لیجئے''۔

آپ ﷺ نے ان لوگوں پر لعنت فرمائی جو جنگ بدر میں کفر پر مارے گئے تھے، کیونکہ ان کا انجام معلوم تھا، لیکن جب آپ ﷺ نے ان پر لعنت فرمائی جنہوں نے بیر معونہ کے موقع پر اصحابؓ کو شہید کیا تھا تو آپ ﷺ کو اس سے منع کر دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

''لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ''۔

(آل عمران:۱۲۸)

ترجمہ:۔''اے پیغمبر! اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں، یا اللہ ان کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں''۔

رہا یہ کہ یزید پر لعنت جائز ہے یا نہیں؟ تو اہل سنت کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ یزید سے قتل اور اجازتِ قتل دونوں یقینی طور پر ثابت نہیں ہیں، لہذا اس پر لعنت کا شرعاً جواز نہیں ہے۔

۹:۔ راگ اور شاعری

راگ اور شاعری کونسی حلال ہے اور کونسی حرام اور کیا شرائط وآداب ہیں؟ یہ تفصیلی بحث ہے اور اس کے جواز وعدم جواز میں بھی علماء کا اختلاف ہے، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کا رسالہ ''حق السماع'' مطالعہ کرنا چاہئے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو اچھی شاعری اچھی اور بری شاعری بری ہے، البتہ شاعری کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا اور اسے اپنا مشغلہ بنانا اچھا نہیں ہے، سرکار دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''لأن یمتلئ جوف أحدکم قیحاً حتی یریه خیر له من أن یمتلئ شعرا''۔

(بخاری، ج:۲،ص:۹۰۹)

ترجمہ:۔''تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے اور وہ اسے خراب کر دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھر جائے''۔

نہ شعر کہنا حرام ہے، نہ شعر بنانا، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی بات شرعی حدود سے متجاوز نہ ہو، حدیث شریف میں ہے: ''إن من الشعر لحکمة''۔ (بخاری، ج:۲،ص:۹۰۸)....بلا شبہ بعض اشعار حکمت سے پُر ہوتے ہیں''۔ اشعار عموماً مدح وذم کے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں جھوٹ کی بڑی گنجائش ہے، تاہم نہ مطلق ہجو (مذمت) ناپسندیدہ ہے، نہ مطلق مدح (تعریف) مکروہ، دونوں کے اپنے اپنے مواقع ومحل ہیں، خود سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے کفار کی ہجو بیان کرنے کے لئے کہا۔ (بخاری ومسلم، براء بن عازبؓ) شعر وشاعری میں حد درجہ مبالغہ آمیزی درست نہیں۔

۱۰:۔ مزاح

مزاح اگر تھوڑی مقدار میں ہو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن کثرتِ مزاح بھی ممنوع اور ناپسندیدہ ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لاتمار أخاک ولاتمازحه''۔ (ترمذی، ج:۲،ص:۲۰)

ترجمہ: ''نہ اپنے بھائی کی بات کاٹ اور نہ اس سے مذاق کر''۔

اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ چونکہ بات کاٹنے میں متکلم کی توہین اور اسے اذیت میں مبتلا کرنا ہے، لہذا یہ منع ہے اور مزاح میں اگر چہ کسی کی اہانت یا اذیت دینا مقصود نہیں، تاہم اس میں مبالغہ کرنا یا مداومت اختیار کرنا ممنوع اور انجام کے اعتبار سے نقصان دہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ سے مزاح منقول ہے، لیکن ان

حضرات کے مزاح کو اپنے مزاح پر قیاس کرنا درست نہیں، اگر کوئی شخص واقعۃً اس مزاح پر قادر ہو جو آپ ﷺ اور آپ کے اصحابؓ سے منقول ہے تو یہ نہ مذموم ہے، نہ غیر پسندیدہ، بلکہ ایک درجہ میں مسنون ومستحب عمل ہے۔ آپ ﷺ کے مزاح میں نہ جھوٹ کی آمیزش تھی، نہ کوئی ایسی بات تھی جس سے دوسروں کو ایذاء ہوتی ہو، نہ اس میں مبالغہ تھا، بلکہ آپ شاذ ونادر ہی مزاح کیا کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: میں مذاق کرتا ہوں، لیکن: ''ولاأقــول إلا حــقــا'' ۔(ترمذی، ج:۲،ص:۲۰) یعنی ''میں سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہتا''۔ یہ آپ ﷺ ہی کی شان تھی کہ خوش طبعی اور دل لگی کے مواقع پر بھی زبان سے کلمۂ حق ہی نکلتا، دوسرے لوگ خواہ کتنے اعلیٰ درجے پر ہی فائز کیوں نہ ہوں، مذاق کے کوچے میں قدم رکھنے کے بعد کذب سے اپنا دامن بچانے پر قادر نہیں رہتے، ان کا مقصد لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے، خواہ کسی طرح بھی ہنسائیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی مزاح کو پیشہ بنالے اور روز وشب کے مشغلے کے طور پر اپنائے رکھے اور پھر رسول اکرم ﷺ کے فعل سے حجت پکڑے اور یہ سمجھے کہ میں آپ ﷺ کی اتباع کررہا ہوں، یہ جہالت کی بات ہوگی۔

۱۱:۔استہزاء

کسی کا مذاق اڑانا بھی پسندیدہ عمل نہیں ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے، قرآن کریم میں ہے:

''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لاَیَسْخَرْقَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰی أَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلاَ نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی أَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ''۔ (الحجرات:۱۱)

ترجمہ:۔''اے مؤمنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں، عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں''۔

تمسخر کے معنی ہیں اہانت وتحقیر کے ارادے سے کسی کے عیب بیان کرنا کہ سننے والے کو ہنسی آجائے۔ تمسخر قول، اشارے، کنائے اور کسی کے فعل کی نقل سے بھی ہوتا ہے، اگر پس پشت ہو تو یہ غیبت ہے اور سامنے ہو تو تمسخر واستہزاء ہے، بہت ساری احادیث میں نبی کریم ﷺ نے دوسروں کی نقل اتارنے، کسی کے ساتھ تمسخر واستہزاء سے منع فرمایا ہے۔

۱۲:۔افشاءِ راز

کسی کا راز افشاء کرنا بھی منع ہے، کیونکہ یہ ایک خیانت ہے اور دوستوں اور شناساؤں کی حق تلفی ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''إذا حدث الرجل الحديث ثم التفت فهی أمانة''۔(ترمذی،ج:۲،ص:۱۷)

ترجمہ:۔''جب کوئی آدمی بات کہے اور چلا جائے تو یہ امانت ہے''۔

۱۳:۔جھوٹا وعدہ

انسان کی زبان وعدہ کرنے میں سبقت کرتی ہے، پھر بعض اوقات نفس زبان کے وعدہ کا پاس نہیں رکھتا اور اسے وفا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس صورت میں وعدہ خلافی ہوتی ہے، یہ امر نفاق کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ''۔ (مائدہ:۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے پیغمبر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس وصف کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ وعدے کے پکے تھے، ارشاد ربانی ہے:''إِنَّهُ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلاً نَبِیاًّ''۔(مریم:۵۴)....''وہ وعدے کے سچے اور ہمارے بھیجے ہوئے نبی تھے''۔

احادیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے وعدہ پورا نہ کرنے والے کے لئے شدید وعید بیان فرمائی، مسلم شریف میں ہے:

''آیة المنافق ثلث وإن صام وصلی وزعم أنه مسلم، إذا حدث کذب وإذا وعد أخلف وإذا اؤتمن خان''۔ (مسند ابویعلی، ج:۱۱،ص:۴۰۶)

ترجمہ:۔''تین باتیں جس میں ہوں وہ منافق ہے، اگر چہ وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں، ایک یہ کہ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے''۔

۱۴:۔جھوٹ بولنا اور قسم کھانا

یہ بھی بدترین عیب اور عظیم گناہ ہے، دونوں سے متعلق سرکار دوعالم ﷺ کے کثیر ارشادات منقول ہیں، ارشاد نبوی ہے:

''ما یزال العبد یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عند الله کذابا''۔

(ترمذی،ج:۲،ص:۱۸)

ترجمہ:۔''بندہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ کی جستجو میں رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھا جاتا ہے''۔

ترمذی شریف میں ہے:

''ما حلف حالف باللہ یمین صبر فأدخل فیھا مثل جناح بعوضۃ إلا جعلت نکتۃ في قلبہ إلی یوم القیامۃ''۔ (ترمذی، ج:۲،ص:۱۳۱)

ترجمہ:۔''کوئی قسم کھانے والا قسم کھاکر کوئی بات کہے اور اس میں مچھر کے پَر کے برابر (جھوٹ) داخل کرے تو یہ اس کے دل پر قیامت تک کے لئے ایک (سیاہ) داغ بن جائے گا''۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے:

''إیاکم والکذب فإن الکذب یھدی إلی الفجور وإن الفجور یھدی إلی النار''۔ (ابوداؤد)

ترجمہ:''جھوٹ سے بچو، اس لئے کہ جھوٹ برائی کی طرف لے جانے والا ہے اور برائی جہنم لے جانے والی ہے''۔

۱۵:۔غیبت اور چغل خوری

غیبت یہ ہے کہ کسی آدمی کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ اگر وہ سنے تو برا جانے، خواہ اس ذکر میں اس کے جسمانی نقص، اخلاقی عیب یا اس کے قول وفعل کو ہدف بنایا جائے۔ نبی کریم ﷺ سے غیبت سے متعلق دریافت فرمایا گیا تو آپ ﷺ نے یہی تعریف فرمائی:''ذکرک أخاک بما یکرھہ''۔(ترمذی، ج:۲، ص:۱۵) یعنی''اپنے بھائی کی ناپسندیدہ بات کا ذکر کرنا غیبت ہے''۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر وہ بات اس میں موجود ہو؟ فرمایا: اگر موجود ہو تو غیبت ہے، ورنہ تہمت ہے۔

غیبت صرف زبانی ذکر ہی کو نہیں کہتے، بلکہ ہر وہ عمل غیبت میں داخل ہے جس سے کسی کا عیب دوسرے پر ظاہر ہو، خواہ اشارے سے ہو یا کنائے سے۔

چغل خوری کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کا قول اس آدمی کے سامنے نقل کیا جائے جس کے بارے میں کہا گیا ہو، مثلاً یہ کہا جائے کہ فلاں شخص تمہارے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، خواہ یہ بات کہنے والے کو بری لگی یا جس کے بارے میں کہا گیا ہو۔غرض چغلی ناپسندیدہ بات کے اظہار کا نام ہے، یہ سنگین جرم ہے اور چغل خوری کا شر بڑا ہے، یہ تفریق بین المسلمین اور فساد کا سبب ہے، قرآن کریم کی کثیر آیات اور نبی کریم ﷺ کی بے شمار روایات میں غیبت اور چغل خوری کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں غیبت کو اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے:

''وَلَایَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضاً اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتاً

فَکَرِهْتُمُوْهُ''۔ (الحجرات:۱۲)

ترجمہ:۔''اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟''۔

چغل خوری سے متعلق ارشاد ہے:

''وَلَاتُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ، هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيْمٍ''۔ (القلم:۱۰،۱۱)

ترجمہ:''اور کسی ایسے شخص کے کہنے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے، طعن آمیز اشارے کرنے والا، چغلیاں لئے پھرنے والا ہے''۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:''وَيْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ''۔(ھمزہ:۱)....''ہر طعن آمیز اشارے کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے''۔اس آیت میں بھی بعض مفسرین نے ''لُمَزَةٌ'' سے چغل خوری مراد لیا ہے۔حضرت جابرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''الغيبة أشد من الزنا''۔(مشکوٰۃ، ج:۲،ص:۴۱۵)....:''غیبت زنا سے سخت تر ہے''۔وجہ یہ ہے کہ آدمی ارتکاب زنا کے بعد توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرمادیں تو اس گناہ سے نجات پا جاتا ہے، لیکن غیبت کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کردے، جس کی غیبت کی گئی ہے، ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

''لما عرج بي مررت بقوم لهم أظفار من نحاس يخمشون وجوههم وصدروهم فقلت من هؤلاء يا جبريل؟ قال: هؤلاء الذين يأكلون لحوم الناس ويقعون في أعراضهم'' (ابوداؤد، ج:۲،ص:۳۲۶)

ترجمہ:۔''معراج کی رات میرا گذر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے ان ناخنوں سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے جبریلؑ سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں اور ان کی آبرو سے کھیلتے ہیں''۔

چغل خور کے بارے میں ارشاد نبوی ہے:

''لایدخل الجنة نمّام''۔ (مسلم،۱،ص:۷۰)

ترجمہ:۔''چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو زبان کی آفتوں اور شرور سے محفوظ رکھے۔آمین

حضرت مولانا قاری شریف احمدؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

قاری تنویر احمد شریفی، کراچی

میرے جدامجد حضرت الاستاذ مولانا قاری شریف احمد نوراللہ مرقدہٗ کی پیدائش ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء کی ہے، جب کہ محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ کی پیدائش ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ/ ۲۸ اپریل ۱۹۰۸ء کی ہے۔ ان دونوں بزرگوں میں چھ سال کی چھوٹ بڑائی ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں تعلیمی مراحل گزارے، جب کہ حضرت بنوریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، حضرت بنوریؒ اور حضرت قاری صاحبؒ نے دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سے کیا۔ حضرت بنوریؒ کی فراغت شعبان المعظم ۱۳۴۷ھ/ جنوری ۱۹۲۹ء کی ہے، جب کہ حضرت قاری صاحبؒ کی فراغت شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ/ اکتوبر ۱۹۳۸ء کی ہے۔ فضلائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت بنوریؒ کا نمبر پہلا اور حضرت قاری صاحبؒ کا چار سو ستتر واں نمبر ہے۔ دونوں بزرگوں کے اساتذۂ کرام میں بعض مشترک ہیں، مثلاً: افضل المفسرین حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہویؒ، حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی عرف باباؒ۔ ان دونوں بزرگوں میں آپس میں بڑی محبت اور تعلق تھا۔ حضرت قاری صاحبؒ یہ واقعات بتلایا کرتے تھے، یہاں میں انہیں قلم بند کر رہا ہوں:

۱...... حضرت قاری صاحبؒ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بیتے ہوئے زمانۂ طالب علمی کی یادداشت بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میرے استاذ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے میری تجوید دیکھتے ہوئے حکم فرمایا تھا کہ جہری نمازیں پڑھایا کروں، حضرت بنوریؒ جو اس زمانے میں فیض الباری کی اشاعت کے سلسلے میں باہر جاتے رہتے تھے، لیکن جب ڈابھیل تشریف لاتے تو ان میں اور مجھ میں نماز پڑھانے کا مسابقہ ہوتا تھا، کبھی مصلے پر جانے کے لئے وہ سبقت لے جاتے اور کبھی میں۔

حضرت بنوریؒ کے شیخ اول اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہ کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا شفیع الدین نگینویؒ تھے، جن سے آپ کو خلافت بھی ملی، شیخ نے حکم دیا تھا کہ ہندوستان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ یا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رابطہ رکھیں، چنانچہ حضرت بنوریؒ حضرت مدنیؒ کے فیض صحبت سے مستفید ہوتے رہے، ساتھ ہی

حضرت تھانویؒ سے بھی تعلق رہا، حضرت تھانویؒ نے مجازِ صحبت بھی بنایا مولانا قاری کرنل (ر) فیوض الرحمٰن مدظلہ نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مدنیؒ کی طرف سے بھی آپ کو اجازتِ بیعت حاصل تھی۔ (مشاہیر علماءِ دیو بند، ص:۲۳۸، طبع اول)

حضرت قاری صاحبؒ کے شیخ اول حضرت مدنیؒ تھے، اور شیخ ثانی حضرت مدنیؒ کے خلیفۂ مجاز اور تلمیذ ارشد حضرت مولانا سید حامد میاںؒ تھے، حضرت مدنیؒ سے اسی تعلق کی بنا پر حضرت بنوریؒ اور حضرت قاری صاحبؒ دونوں میں تعلقِ محبت فطری تھی۔

۲......۱۹۶۹ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے علمی جانشین مرشدی ومولائی حضرت اقدس مولانا السید ارشد مدنی اطال اللہ عمرہٗ حجاز سے ہندوستان تشریف لے جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے کراچی بھی آئے۔ حضرت مرشد مدنی مدظلہم نے حضرت بنوریؒ کو فون کیا کہ حضرت قاری صاحبؒ کو بھی اطلاع کر دی جائے، لیکن اس وقت ملاقات نہیں ہوسکی، حضرت مرشد مدنی مدظلہم اپنے ایک مکتوب میں حضرت قاری صاحبؒ کو اسکی تفصیل تحریر فرماتے ہیں:

> ''محترمی ومکرمی زیدت معالیکم ....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
> خدا کرے مزاج گرامی بہ خیر ہوں، راقم الحروف حجاز مقدس سے واپسی میں چند گھنٹوں کے لئے کراچی اترا، شہر میں بھی گیا، ہوائی اڈے پر اتر کر سب سے پہلا کام یہی ہوا کہ مولانا یوسف صاحب بنوری کو فون کیا اور عرض کیا کہ مولانا اکمل صاحب اور آپ کو اطلاع فرمادیں، تھوڑی دیر کے بعد مولانا بنوری صاحب تشریف لے آئے، معلوم ہوا کہ دونوں حضرات کے پاس آدمی بھیج دیا ہے، مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ آپ کے اسم گرامی کے بعد ''خطیب'' نہ لگا سکا، چنانچہ مولانا اکمل صاحب سے تو شرفِ ملاقات حاصل نہ ہوسکا، البتہ قاری شریف صاحب تھانوی تشریف لے آئے، آپ دونوں حضرات سے ملاقات نہ ہوسکنے کا بہت زیادہ صدمہ ہے، بلکہ درحقیقت کراچی میں ٹھہرنے کی خوشی ختم ہوگئی، یہی چیز باعثِ سکون ہوئی کہ اس میں بھی کوئی مصلحت مضمر ہوگی، ممکن ہے یہ کشش پھر دیارِ مقدس میں کھینچ لے جائے، اور اس ہی مقدس جگہ میں ہم لوگ پھر ان شاء اللہ باہم دگر ملاقات کریں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز......''۔

حضرت قاری صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس واقعے کے بعد حضرت بنوریؒ نے معمول بنالیا تھا کہ حضرت مدنیؒ کے صاحب زادگان میں سے کوئی بھی تشریف لاتے اور حضرت بنوریؒ کو اس کی اطلاع ہو جاتی تو فوراً حضرت قاری صاحبؒ کو مطلع فرماتے۔

۳......۱۵/ جولائی ۱۹۶۹ء میں جانشینِ حضرت شیخ الاسلامؒ فدائے ملت حضرت مرشدی مولانا سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ نے پاکستان کا طویل دورہ فرمایا، اس موقع پر حضرت مرشدیؒ کراچی بھی تشریف لائے۔ حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے مخدوم زادےؒ کو جامع مسجد سٹی اسٹیشن کراچی میں

دعوت دی، حضرت فدائے ملتؒ جامع مسجد سٹی اسٹیشن تشریف لائے، حضرت بنوریؒ بھی ساتھ تھے، حضرت قاری صاحبؒ نے دعوت میں اس کا اہتمام فرمایا تھا کہ دہلی مسلم ہوٹل سے شیرمال پکوائے، اور پانچ دس منٹ کے وقفے سے وہ آتے رہتے تھے، تنور سے نکلتے ہی ایک آدمی سائیکل پر لے کر مسجد سٹی اسٹیشن آتا رہتا، یہ جگہ مسجد سے ڈیڑھ کیلومیٹر دور ہے، حضرت فدائے ملتؒ کو اللہ تعالیٰ نے پابندئ وقت کی صفتِ عالیہ سے بھی نوازا تھا، دسترخوان لگنے کے بعد پانچ دس منٹ کھانا لگنے میں دیر ہوئی تو فرمانے لگے: بھئی! دیر کس بات کی ہے؟ حضرت بنوریؒ نے حضرت قاری صاحبؒ کی نیابت کرتے ہوئے فرمایا: مولانا! تھوڑی دیر اور، آج آپ ایسا کھانا کھائیں گے کہ پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔

۴......حضرت قاری صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضرت بنوریؒ سے جب حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوتی تو ہم دونوں میں یہ طے ہوجاتا کہ جہری نمازوں میں جو پہلے میزابِ رحمت کے سامنے نماز کے لئے بیٹھ جائے وہ دوسرے کے لئے جگہ رکھے، چنانچہ حضرت بنوریؒ اگر پہلے پہنچ جاتے تو حضرت قاری صاحبؒ کے لئے اپنے برابر جگہ رکھتے اور اگر حضرت قاری صاحبؒ پہنچ جاتے تو حضرت بنوریؒ کے لئے اپنے برابر جگہ رکھتے۔

۵......حضرت قاری صاحبؒ اکثر جمعہ کے دن عصر کی نماز میں بنوری ٹاؤن مسجد تشریف لے جاتے تھے، حضرت بنوریؒ عصر کے بعد مسجد سے متصل قبلہ رخ پر باغ میں تشریف فرما ہوتے تھے، وہیں ملاقات فرماتے تھے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ نے میرے سر پر حضرت بنوریؒ سے وہیں دست شفقت پھروایا تھا۔ حضرت بنوریؒ کی میں نے کئی مرتبہ زیارت کی، بڑے وجیہ تھے، اللہ تعالیٰ نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی عطا فرمائی تھی۔

۶......حضرت قاری صاحبؒ نے پاکستان بننے کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی قدس سرہ کے تلمیذ رشید اور مجاہد ریشمی رومال تحریک حضرت مولانا محمد صادق سندھیؒ (کھڈا، کراچی) کے حکم پر ۱۹۵۱ء میں ''دائمی نقشۂ اوقات نماز وسحر وافطار'' کراچی کے لئے مرتب فرمایا تھا، اسی زمانے میں خان بہادر حاجی وجیہ الدین میرٹھی مرحوم کا نقشہ بھی موجود تھا، دونوں نقشوں کے اوقات ایک دو منٹ کے اندر درست تھے، دونوں نقشوں پر ہر مکتب فکر کے اہل علم کا اتفاق تھا، حضرت بنوریؒ کو بھی حضرت قاری صاحبؒ کے نقشے پر اعتماد تھا ۱۹۶۹ء میں کراچی کے ایک بزرگ نے ان نقشوں بلکہ اب تک شائع ہونے والے وہ تمام نقشے جو عالم اسلام کے اوقاتِ نماز کے تھے سب پر عدم اطمینان فرمایا اور ان میں صبح صادق اور وقت عشاء کو یک سر غلط اور فحش قرار دیا، ان کی اس نئی تحقیق پر وقت کے اکابر نے اعتماد کرلیا، جن میں حضرت بنوریؒ بھی شامل تھے، ان بزرگوں نے فیصلہ یہ کیا کہ قدیم نقشوں (حضرت قاری صاحبؒ اور حاجی وجیہ الدینؒ کے نقشے) کے مطابق سحری بند کردی جائے، اور فجر کی اذان نئی تحقیق کے مطابق دی جائے، اکابر کے اس فیصلے سے عوام ذہنی الجھن کا شکار ہوگئی، بعض مساجد میں فجر کی دو دو اذانیں ہوئیں، لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ سحری کا وقت اذان فجر تک ہے وہ کھاتے رہتے تھے اور روزے خراب ہوتے رہے، کئی سال تک یہ سلسلہ

چلا۔حضرت قاری صاحبؒ نے اکابر کے اس فیصلے کے بعد اپنا نقشہ شائع کرنا بند کردیا تھا، حضرت قاری صاحبؒ نے جناب پروفیسر عبداللطیف مدظلہم کو تیار کیا کہ وہ علمائے کرام کو صبح صادق کا مشاہدہ کرائیں، انہوں نے اس کا اہتمام کیا اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ (جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن) کے اساتذہ کرام: حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شاہد مدظلہ وغیرہ اور دارالعلوم شرافی گوٹھ کراچی کے علماء: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہما کو مشاہدات کرائے، جس کے نتیجے میں یہ طے ہوگیا کہ قدیم نقشے ہی حسابی اور مشاہداتی اعتبار سے قابل اعتماد ہیں۔

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ان بزرگ کی تحقیق سے رجوع فرمایا تھا، اس کے بعد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے رجوع فرمالیا تھا اور حاجی صاحبؒ اور حضرت قاری صاحبؒ کے نقشے کو درست قرار دیا تھا۔حوالے کے لئے دیکھئے: ''صبح صادق وصبح کاذب''مؤلفہ: جناب پروفیسر عبداللطیف مدظلہم، ص:۷،۸)

حضرت بنوریؒ کی وفات (۳ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ/۱۷اکتوبر ۱۹۷۷ء) کے بعد بھی حضرت قاری صاحبؒ کو بنوری ٹاؤن کے جامعہ علوم اسلامیہ سے قلبی تعلق رہا، مدرسہ کے اربابِ اختیار بھی اپنے اکابر کے قدیم تعلق کو خاطر میں لاتے تھے۔حضرت بنوریؒ کی وفات کے بعد مہتمم جامعہ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمانیؒ کی قیادت میں ایک وفد، جس میں حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ، مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا بدیع الزمانؒ، مولانا سید محمد بنوریؒ شامل تھے، حضرت قاری صاحبؒ کے پاس جامع مسجد سٹی اسٹیشن میں مغرب کی نماز میں تشریف لائے، وہ میرا تعلیمی زمانہ تھا اور مغرب کے بعد حضرت قاری صاحبؒ پڑھاتے تھے، اس دن ہماری پڑھائی کی چھٹی ہوگئی۔طالب علم فطرتاً ایسی چھٹی کو بڑی نعمت سمجھتا ہے، چنانچہ ہمارے لئے یہ بڑی خوشی کا دن تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اکابر جامعہ کے معاملے میں مشورے کے لئے تشریف لائے تھے، ان اکابر کے چہروں سے میں شناسا تھا، اس لئے کہ حضرت قاری صاحبؒ جب کہیں تشریف لے جاتے تو راقم الحروف کو بھی ساتھ لے جاتے، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اکابر اور بزرگان دیوبند کی عظمت دل میں گھر کرتی چلی گئی۔حضرت قاری صاحب نوراللہ مرقدہ کی وفات ۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ/۲۷ مارچ ۲۰۱۱ء کو کراچی میں ہوئی، ایک سو سال عمر پائی -**رحمہم اللہ تعالیٰ رحمةً واسعةً**۔ان دونوں بزرگوں نے جو علمی اور روحانی خدمات انجام دیں، اللہ تعالیٰ انہیں قائم رکھے اور ہمیں مزید استفادے کی توفیق عطا فرمائے، ہمیشہ اپنے اکابر کے نقشِ قدم پر رہیں اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ انہیں کی فکر پر موت دے۔آمین!

نوٹ: حضرت بنوریؒ کے تفصیلی حالات کے لئے ماہنامہ بینات کراچی کا ''حضرت بنوریؒ نمبر'' اور حضرت قاری صاحبؒ کے حالات کے لئے ''ندائے صفہ کا قاری شریف احمدؒ نمبر'' اور عن قریب آنے والی کتاب ''تذکرۃ الشریف'' مطالعہ فرمائیے۔

حضرت مولانا سید محمد محسن شاہؒ کی شہادت

مولوی حکیم اللہ وزیر، متعلم جامعہ بنوری ٹاؤن

۱۳ مئی ۲۰۱۲ء بروز اتوار کی صبح ایک ایسی اندوہناک خبر کے ساتھ طلوع ہوئی جس کے سنتے ہی ہر ذی شعور اپنے حواس کو قابو میں نہ رکھ سکا، وجہ اس کی یہ بنی کہ ''موت العالم موت العالم'' کا مصداق جامعہ حلیمیہ درۂ پیزو کے مہتمم حضرت مولانا سید محمد محسن شاہ صاحب محض ''وما نقموا منهم الا ان یومنوا بالله العزیز الحمید'' کی پاداش میں ظالموں کے ہاتھوں ''فمنهم من قضی نحبه'' کا مصداق بنتے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ،إنا لله وإنا الیه راجعون۔

خاندانی پس منظر:

حضرت شاہ صاحبؒ کے آباء واجداد افغانستان کے شہر قندھار سے ہجرت کر کے ''پنیالہ'' کے قریب ''برلبِ شارع عبدالخیل'' میں بسنے لگے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا باقی خاندان اسی جگہ پر آباد ہے، صرف اپنا گھر مدرسہ کی وجہ سے درۂ پیزو میں منتقل کیا، جہاں حضرت کا خاندان آباد ہے، وہیں پر اپنی ایک خانقاہ ''یٰسین زئی'' کے نام سے قائم فرمائی، حضرت کے خاندان میں سے بعض ''دارالعلوم دیوبند'' کے فضلاء بھی ہیں، ان میں سے حضرت کے چچا مولانا محمودؒ اور والد ماجد حضرت مولانا احمد رحمہما اللہ ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے دادا مولانا عبدالحلیمؒ بھی بہت بڑے عالم تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان اور قائدِ جمعیت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے خاندان کا آپس میں تعلق:

ان دونوں خاندانوں کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے، مفکر اسلام حضرت مفتی محمودؒ کا اصلاحی تعلق حضرت شاہ صاحبؒ کے آباء واجداد سے تھا، ابتداء میں حضرت قائدِ جمعیت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا اصلاحی تعلق حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان سے تھا، لیکن بعد میں مولانا نے اپنا اصلاحی تعلق حضرت خواجہ خان محمدؒ سے قائم کر لیا تھا، قائد جمعیت اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درمیان

انتہاء درجے کی بے تکلفی اور بے پناہ محبت تھی، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ قائد جمعیت جب جامعہ حلیمیہ تشریف لاتے تو حضرت شاہ صاحبؒ کسی طالب علم سے فرماتے کہ: جاؤ مولوی صاحب کے لئے مطبخ سے گرم گرم روٹی اور بغیر دودھ والی چائے بنا کر ان کی خدمت میں پیش کرو، میں سبق پڑھا کر آتا ہوں، قائد جمعیت اس جملے کو سن کر بہت خوش ہوتے اور مسکرا کر شیخ الحدیث مولانا محمد انور صاحب دامت برکاتہم کے کمرے میں طلباء کے جم گھٹے میں تشریف لے جاتے۔

حصولِ علم:

حضرت نے ابتدائی علوم اپنے چچا محترم مولانا محمودؒ سے حاصل کئے، اس کے بعد مزید علوم کی پیاس بجھانے کے لئے جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے راہی ہوئے، یہ وہ دور تھا جب حضرت مولانا عبدالحقؒ جامعہ حقانیہ میں ہی جلوہ افروز ہوا کرتے تھے، جامعہ حقانیہ سے فراغت کے بعد شاہ صاحبؒ نے اپنے علاقے درۂ پیزو میں جامعہ حلیمیہ کی بنیاد حضرت کے دادا مولانا عبدالحلیمؒ اور مفکر اسلام مفتی محمودؒ کے دست مبارک سے رکھوائی۔

جامعہ حلیمیہ پر اک نظر:

اِنہیں بزرگوں کی برکات کا نتیجہ تھا کہ جامعہ حلیمیہ ابتدائی دور سے تا حال انتہائی سادہ انداز میں دین کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے، جس کے متعلق استاذ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن مولانا محمد انور بدخشانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا تھا کہ ''یہی مدارس ہیں جو دورِ قدیم کے طرزِ تعلیم کو یاد دلاتے ہیں'' کیونکہ وہاں کی درس گاہوں میں طلباء زیادہ تعداد میں ہونے کی بنا پر بغیر تپائی کے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر علوم نبوی کے حصول میں لگے ہوتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے انار کے پیڑ کی تاریخ دُہراتے نظر آتے ہیں۔

یہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اخلاص ہی کا نتیجہ ہے کہ اتنے پسماندہ علاقے میں اتنا بڑا ادارہ بہترین انداز میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو بحسن وخوبی سرانجام دے رہا ہے، تبھی تو حضرت ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب نے فرمایا کہ: ''چھوٹے شہر میں بڑا مدرسہ ہے''۔ جامعہ حلیمیہ میں فی الحال تقریباً گیارہ سو طلباء زیر تعلیم ہیں، جن میں سے ڈھائی سو کے لگ بھگ طلباء دورۂ حدیث میں زیر تعلیم ہیں۔

جامعہ حلیمیہ کچھ ایسی خاص صفات کا حامل ادارہ ہے، جو صفات دیگر اداروں میں اس درجے کی نہیں پائی جاتیں، من جملہ صفات میں سے ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہاں کے اساتذہ اور طلباء کا آپس میں انتہائی درجے کی عقیدت ومحبت کا تعلق ہے اور طلباء کا آپس میں تعلق ایسا کے ''**ویؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة**'' کا منظر پیش کرتے نظر آتے ہیں اور وہاں کے

طلباء اس پرتعیش دور میں جن مصائب کو سہتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ قابل دید ہے، تبھی تو ایک بزرگ عالم دین نے فرمایا تھا کہ: جامعہ حلیمیہ کا طرزِ معاشرت دیکھ کر مجھے صحابہ کرامؓ کا طرزِ زندگی یاد آتا ہے۔
حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ادارہ الحمدللہ! دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کی فیوض وبرکات صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں، ان میں خاص طور پر افغانستان قابل ذکر ہے، افغانستان میں جاری صلیبی جنگ میں جامعہ حلیمیہ کا بہت بڑا کردار ہے۔

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیبؒ کا وہ جملہ بجا ہے جو حضرت نے جامعہ حقانیہ کے لئے استعمال فرمایا تھا کہ: ''جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک ثانی دارالعلوم دیوبند ہے''۔ تو اسی طرح صوبہ خیبر پختون خواہ میں جامعہ حلیمیہ ثانیٔ جامعہ حقانیہ ہے۔

شاہ صاحبؒ کی شخصیت کے کچھ پہلو:

جس طرح جامعہ حلیمیہ خصوصی صفات کا حامل ادارہ ہے، اسی طرح اس ادارے کے مہتمم حضرت شاہ صاحبؒ بھی صفات حسنہ سے مالا مال تھے۔ مختصر طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے اتنا ہی کہنا درست ہے کہ ''کم خرچ بالانشین'' کے مصداق تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ درویش صفت شخصیت اور پختہ علم کے حامل تھے، رہن سہن اور کھانے پینے میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی اختیار کئے ہوئے تھے اور تقویٰ میں ''**إنما یخشی الله من عباده العلماء**'' کا مصداق تھے۔ حضرت نہایت ہی نرم خو اور شفیق طبیعت کے مالک تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو غیبی صفات سے بھی نوازا تھا، اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جمعرات کی شام کو طلباء حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے کہ گھر جانا ہے اور پیسوں کی ضرورت ہے تو حضرت جیب میں ہاتھ ڈالتے تو جتنے نکلتے، طلباء کو تھما دیتے۔

استاذ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن حضرت مولانا فضل محمد صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ: ''شاہ صاحبؒ جیسی درویش صفت اور خدا ترس، خالص علمی شخصیت دنیا میں نہیں دیکھی''۔

شاہ صاحبؒ کی خدمات:

حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی خدمات کے ساتھ ساتھ اصلاحی، جہادی اور سیاسی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے اصلاحی سلسلے سے سینکڑوں مریدین مستفید ہو رہے تھے۔ سیاسی میدان میں جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ساتھ گہرا تعلق تھا، جس کے بدولت جمعیت علمائے اسلام کے دو مرتبہ ضلعی امیر بھی رہ چکے تھے، اس کے علاوہ دیگر سیاسی معاملات کو حل کرتے نظر آتے تھے۔ علمی میدان میں حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے ہزاروں شاگرد زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف

حاصل کر چکے ہیں۔

حضرت ایک طویل عرصہ سے جامع ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف اور اصول فقہ کی مشہور درسی کتاب نور الانوار اور علم الصرف میں علم الصیغہ کا درس دیا کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے پیچھے دو بیٹیاں، ایک بیوہ اور چار بیٹے سوگوار چھوڑے ہیں، جن میں سے ایک مولانا عبد الغنی صاحب جامعہ بنوری ٹاؤن سے متخصص ہیں اور نہایت ہی قابل مفتی ہیں اور جدید مسائل پر کافی دسترس رکھتے ہیں، دوسرے صاحبزادے مولانا عبد الحئ بھی قابل قدر مدرس ہیں اور یہ دونوں حضرات جامعہ حلیمیہ میں ہی درس وتدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، جبکہ تیسرے اور چوتھے صاحبزادے ابھی طلبِ علم میں مصروف ہیں اور پانچویں صاحبزادے محمد ابراہیم پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔

حضرتؒ کے جانشین:

جامعہ حلیمیہ کی شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق حضرت کے بڑے صاحبزادے مولانا عبد الحئ کو ''خانقاہ یٰسین زئی'' کا جانشین مقرر کیا گیا ہے، جبکہ دوسرے صاحبزادے مولانا عبد الغنی کو جامعہ حلیمیہ میں اہتمام کا عہدہ سپرد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح معنوں میں جانشینی کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی دینی خدمات دشمن کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتی رہیں، جن کی پاداش میں بالآخر ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ کی اخیر شب بوقتِ تہجد صلوٰۃِ تہجد سے فراغت کے بعد اپنی آرام گاہ میں آرام فرمانے گئے تھے کہ دین دشمنوں نے سائلنسر لگے اسلحے سے حضرت کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا۔

حضرتؒ کی نماز جنازہ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدظلہ نے پڑھائی، جس میں معتقدین کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی، جس میں ہر ایک کی آنکھ اشکبار تھی، حضرتؒ اپنے شاگردوں کی سسکیوں میں اپنے ہی گلشن میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

☆☆...☆☆

مجسم وفا، مولانا مفتی عرفان حمید شہیدؒ

مولانا سہیل یوسف میمن صاحب

زندگی اور موت کا فلسفہ بھی کتنا عجیب ہے، ہنستی محفلوں کو اجاڑتا اور کھلی بہاروں کو خزاں میں بدل دیتا ہے، ۲۰ راپریل ۲۰۱۲ء کو ہونے والے طیارہ کے حادثے کی خبر کو لاکھوں بلکہ کڑوروں انسانوں کے لیے معمول کی ایک حادثاتی خبر کی طرح سنا ہوگا، درد دل رکھنے والوں نے دعائے مغفرت پر ہی اکتفاء کرلیا ہوگا، لیکن اس دن مجھ پر کیا گذری یہ میں ہی جانتا ہوں اور میرا رب!

میرے شیخ ومربی اور محسن حضرت مولانا عطاء الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ اپنی ہمشیرہ اور باوفا شاگرد مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ کے ساتھ راہی ملک عدم ہوئے، اور تاقیامت اپنی حسین یادیں دل میں چھوڑ گئے، حضرت شیخ رحمہ اللہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور ان شاء اللہ لکھا جاتا رہے گا، ان کی یاد کے ساتھ ان کے اس رفیق دنیوی اخروی کا ذکر بھی ہوتا رہے گا۔

میرے مخلص دوست مولانا مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ نے ۱۵راگست ۱۹۸۱ء کو اسی شہر کراچی میں آنکھ کھولی اور اقراء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ فتحیہ گارڈن میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی پھر اسی میں درجہ اولیٰ سے درس نظامی کا آغاز کیا، ۱۹۹۵ء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں درجہ ثانیہ میں داخلہ لیا اور ۲۰۰۱ء میں جامعہ سے ہی درس نظامی کی تکمیل کے بعد درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی میں داخلہ لے لیا، ۲۰۰۳ء میں تخصص سے فراغت ہوئی، تخصص کے بعد ایک سال تک تو کچھ دنیوی مشاغل میں وقت گزارا لیکن پھر ۲۰۰۵ء میں حضرت مولانا ارشاد اللہ عباسی شہید رحمہ للہ کے زیر اہتمام ''جامعہ الحراء للبنین والبنات گارڈن'' میں تدریسی سلسلہ سے وابستہ ہوگئے اور تاحیات اس ادارے سے وابستہ رہے، اس دوران میٹرک اور انٹر کے امتحانات بھی دیئے اور اپنی صلاحیتوں کی بناء پر کم عمری میں درس نظامی کی بڑی کتابیں پڑھانے لگے۔

ہدایہ اور ترمذی شریف جیسی اہم کتابیں مولانا عباسی شہید رحمہ اللہ کی زندگی میں پڑھاتے تھے۔ ۲۰۱۱ء میں مولانا کی شہادت کے بعد صحیح بخاری شریف پڑھانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔

بلاشبہ مولانا عباسی رحمہ اللہ کا سانحہ مذکورہ مدرسہ کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا، جس سے

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی طرح اس مدرسہ میں بھی بہت بڑا خلا پیدا ہوا، لیکن مولانا عرفان شہید رحمہ اللہ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے مدرسہ کا انتظام بحسن خوبی سنبھالا۔

جامع مسجد صالح صدر میں ہونے والے تعلیم وتربیت ''چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس'' کا آغاز تو ۱۹۹۸ء سے ہو چکا تھا، لیکن اس کا باقاعدہ کوئی نصاب کتابی صورت میں مرتب نہ تھا، بلکہ اساتذہ خود ہی حضرت استاد جی رحمہ اللہ کی راہنمائی میں اسباق مرتب کر کے ان کو فوٹو کاپی کروا کر طلبہ میں تقسیم کر دیتے تھے، ۲۰۰۶ء میں حضرت استاد جی رحمہ اللہ نے بندہ سے کہا کہ تم عرفان صاحب سے معلوم کرو، اگر وہ کورس میں پڑھانے کی خواہش رکھتے ہوں تو کہدو، میں خود اس لیے نہیں کہتا کہ وہ بادل ناخواستہ بھی حکم سمجھ کر مجبور ہوگا۔ یہ حضرت استاد جی رحمہ اللہ کا ایک منفرد انداز تھا، جس کے ذریعے وہ ہر ایک کی دلی خواہش کا پاس رکھ کر اس کے مطابق کام لیا کرتے تھے، بندہ نے مفتی عرفان حمید رحمہ اللہ سے بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے، پھر وہ آئے کیا کہ چھا گئے، سب سے پہلے انہوں نے کورس کے اسباق کمپوز کیے، پھر کتابی صورت میں لانے میں وہ پیش پیش رہے، ہر سال جامع مسجد صالح صدر کے ساتھ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں بھی کورس کی تدریسی خدمت سرانجام دیتے رہے، شہادت سے قبل آخری دنوں میں بھی اس سلسلے کی ایک ابتدائی کتاب کا مسودہ (جو اب تک فوٹو کاپی ہی کی صورت میں ہے) تکمیل کے آخری مراحل میں تھا، اور حضرت استاد جی سفر پر روانگی کے وقت آخری بار نظر ڈالنے کے لیے ساتھ لے کر گئے تھے، لیکن

ما کل ما یتمنی المرأ یدرکہ

تجری الریاح بما لا تشتھی بہ السفن

میرے محسن اور دوست بہت سی خوبیوں کے حامل انسان تھے، کم عمری میں اپنی صلاحیتوں اور بہترین اخلاق کی بناء پر اپنے اساتذہ، خاندان اور متعلقین شاگردوں میں مقبول تھے، خاندان کے بڑے بھی اہم امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے، اور وہ بھی ہر ایک ساتھ اس کے مرتبے کے موافق پیش آتے، ہر ایک کے کام آنا اور اس کی ضرورت پوری کرنے میں اپنا وقت صرف کرنا ان کا ایک خصوصی وصف تھا، چھوٹا بڑا کوئی بھی کسی کام کا کہدیتا تو وہ اس کو پورا کرنے میں جت جاتے، اور معمولی کام کو بھی اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی تھیں، جو اپنے اساتذہ کی مسلسل صحبت سے ان میں منتقل ہوئی تھیں، معاملات میں بے حد صاف تھے، جو زندگی کا ایک مشکل کام ہوتا ہے، میں مولانا کو اس سلسلے میں اتنا ذمہ دار شخص نہیں سمجھتا تھا، ان کی شہادت کے بعد جب ان کی ذاتی ڈائری دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے تھے، چنانچہ ان کا تمام حساب کتاب مکمل طور پر اس ڈائری میں محفوظ تھا، میں ان کی اس صفائی معاملات پر بہت حیران بھی ہوں اور اپنی بدگمانی پر شرمسار بھی۔

قدرت نے انہیں باذوق بنایا تھا، زندگی کے ہر پہلو میں اس کا ظہور ہوتا تھا، رہن سہن، لباس و پوشاک، بلکہ ہر چیز میں وہ ذوق رکھتے تھے، اور ہم جیسے بے ذوقوں کو اس طرف متوجہ کرتے رہتے تھے، نیز حضرت استاد جی رحمہ اللہ کے ساتھ بھی ان کا انتہائی اور بے تکلف تعلق تھا، وہ استاذ جی پر جان چھڑکتے تھے، تو استاذ محترم بھی ان کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے، اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد تو حضرت استاذ جی ہی ان کا سب کچھ تھے، ہر ہر مرحلے پر وہ انہیں سے پوچھ پوچھ کر قدم اٹھاتے تھے، حضرت استاد جی رحمہ اللہ کو خدا تعالیٰ نے جو رعب و وجاہت عطاء فرمایا تھا، اس کی بناء پر ہم جیسوں کو باجود قرب وتعلق کے ان کے سامنے ہر بات کرنے کی جرأت اور ہمت نہیں ہوتی تھی، ایسے میں مولانا عرفان شہید جیسا مزاج شناس ہی تھا، جو ہمارے کام آتا اور استاد جی سے بات کرکے ہمارا مسئلہ حل کرتا تھا۔ نہ وہ ہستیاں رہیں اور نہ ان کے ساتھ بیتے لمحے، بس ان کی یادیں اور باتیں ہی ہماری متاع گراں مایہ ہیں۔

مولانا عرفان شہید رحمہ اللہ کا نکاح ۲۰۰۳ء میں ختم بخاری شریف میں مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ نے پڑھایا تھا، اللہ نے انہیں دو پیارے سے بچوں اور ایک بچی سے نوازا تھا، بچی اس وقت چار ماہ کی ہے، ایک بچہ پیدائشی نابینا ہے۔ اور نمائش چورنگی پر واقع بصارت سے محروم بچوں کے اسکول میں زیر تعلیم ہے، اللہ تعالیٰ ان بچوں کی کفالت اور ان کی تربیت فرمائے، آمین، ان کے والد کا تو انتقال ہو چکا تھا، البتہ والدہ حیات ہیں، بڑھاپے کی اس عمر میں جوان سالہ بیٹے کی شہادت کا صدمہ جس طرح انہوں نے برداشت کیا، یہ انہیں کا حوصلہ ہے، اور اہلیہ کا صبر اور ہمت بھی قابل صد ستائش ہے۔ مولانا کے دو بھائی ہیں، ایک ان سے بڑا اور ایک چھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

۲۰/اپریل ۲۰۱۲ء بطابق ۲۷/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ کو وہ ہم سے کراچی ائیر پورٹ پر رخصت ہو کر اسلام آباد اور وہاں سے مردان کے لیے روانہ ہوئے تھے، لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ اب دوبارہ اس فانی دنیا میں ہماری ملاقات نہیں ہوگی، روانگی سے دو دن قبل ہی مجھے علم ہوا کہ وہ استاد جی رحمہ اللہ کے ساتھ سفر پر جا رہے ہیں میں نے کہا کہ مجھے بھی بتلا دیا ہوتا تو میں بھی ساتھ چلا جاتا، تو وہ کہنے لگے کہ تم بھی چلو، بھوجا کا ٹکٹ تو مل ہی جائے گا، لیکن پھر میرا نظم نہ بن سکا، کاش کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی روانہ ہو جاتا لیکن جدائی کا یہ صدمہ میرے نصیب میں لکھا جا چکا تھا، اور قدرت خداوندی نے مجھ ناتواں سے ایک اور امتحان لینا منظور کر لیا تھا۔ مفتی عرفان شہید کی نماز جنازہ حضرت مولانا سید سلیمان بنوری صاحب (نائب مہتمم علامہ بنوری ٹاؤن) نے پڑھائی اور دنیا کی طرح استاد جی کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔ فانا راض بقدر اللہ وقضائہ، اب اللہ ہی ہماری دستگیری فرمائے اور ہمیں صبر دے، استاد جی رحمہ اللہ اور مولانا عرفان حمید شہید رحمہ اللہ اور تمام شہداء کی قبور کو باغ جنت بنائے اور ہمیں بھی ان کے مشن کی تکمیل کا حصہ بنا کر جنت میں اکٹھا فرمائیں۔..................آمین ثم آمین

حضرت عطا شہیدؒ کا تحقیقی ذوق

مولوی عمران ممتاز

جمعہ ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰/ اپریل ۲۰۱۲ء کو راولپنڈی کے مضافات میں واقع حسین آباد (کورال چوک) نامی دیہات میں رونما ہونے والے فضائی حادثے نے جہاں کئی آنکھوں کو اشکبار چھوڑا ہے، وہاں اس حادثے کی نذر ہونے والی کئی ہستیوں کی یادوں کے اجالے بھی تادیر باقی چھوڑے ہیں۔

استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمن شہید نور اللہ مرقدہ و برد اللہ مضجعہ ایک جامع شخصیت تھے، جن کی ہر صفت کو اگر زیبِ قرطاس کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں، ایسا کیوں نہ ہو؟ علم اور اہل علم کی محبت اللہ اور اس کے حبیب رسول ﷺ سے والہانہ عشق و محبت طلبہ کے ساتھ خصوصی شفقت، حضرت بنوریؒ سے بے پناہ عقیدت اور جامعہ سے فدائیت وفنائیت کا تعلق، دنیا کی بے ثباتی پر یقین اور زہد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونا، تربیت کا عمدہ انداز، جیسی یکتا صفات ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ اپنی ذات میں اک انجمن اور کئی قابل تقلید اوصاف کے جامع تھے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر
أن یجمع العالم فی واحد

استاذ محترمؒ تحقیق و تدقیق کے میدان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے، اس فن میں ان کا منفرد انداز تھا، وہ آج کل کے ایسے روایتی محققین کی من گھڑت اور خود ساختہ تحقیقات سے ناخوش تھے۔ جو دین کو زمانے کے رنگ میں رنگنا دین کی خدمت سمجھتے ہیں۔ درس کے دوران بسا اوقات ان لوگوں پر نکیر فرماتے جو اپنی جیبوں میں اپنے من پسند فیصلوں کے لئے آیات یا احادیث کی فوٹو کاپیاں لئے پھرتے ہیں اور تحقیق کے نام پر لوگوں بلکہ علماء کے دلوں میں شکوک وشبہات کے ایسے بیج بوتے ہیں، جو مناسب موقع پر مناسب تدابیر اختیار نہ کرنے کی وجہ سے تناور درخت کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ جب استاذ محترمؒ درس پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ

کے دروازے سے نکل رہے تھے تو ایک ایسے شخص نے ان کی طرف اپنی لکھی ہوئی تفسیر بڑھائی جو تفسیر قرآن کے لئے ضروری علوم پر قادر نہ تھے، حضرت استاذؒ نے پہلی سورت (سورۃ الفاتحہ) کے پہلے لفظ (الحمد لله) سے متعلق ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کا ترجمہ کیا ہے، ''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں'' اس میں لفظ ''تمام'' کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ اس پر وہ صاحب لا جواب ہو گئے، استاذ محترمؒ نے فرمایا کہ: اگر آپ مدرسہ میں جاکر اس فن کے ادنیٰ طالب علم سے بھی یہ سوال پوچھیں گے تو وہ آپ کو جواب دے دے گا۔ اس مناقشہ سے ان کی غرض صرف لا جواب کرنا نہیں تھا، بلکہ مذکورہ بالا فاسد نظریہ اور لادینی کی تحریک کا انسداد مقصود تھا۔

حضرت استاذؒ جس علم یا فن میں بات کرتے تحقیق وتدقیق کے ساتھ سیل رواں کا مظہر بن جاتے۔ تفسیر وحدیث کے درس کے دوران عشق الٰہی اور عشق نبوی میں ڈوبتے ہوئے وہ نکات بیان فرماتے جو کسی بھی شرح میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے۔ کبھی کبھار وجد میں آکر فرماتے: یہ بحث کسی شرح میں نہیں ملے گی، یہ صدر کی شرح سے ہے۔ حضرت شہیدؒ کو فقہ سے بھی حظ وافر عطا ہوا تھا، جس کا اندازہ ان فقہی دقائق سے ہوتا تھا جو وہ دورانِ درس بیان فرماتے تھے۔ اردو اور عربی ادب میں ان کی مہارت اپنی مثال آپ تھی۔ علوم آلیہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے سکتا ہے جسے ان سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا ہو۔ بندہ کو چوں کہ استاذ محترم حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ سے نفحۃ العرب، (نثر ونظم) شرح ملا جامی، تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری (جلد دوم) اور صحیح مسلم (جلد دوم) پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، لہٰذا استاذ محترمؒ کی مختلف علوم میں مختلف تحقیقات کا ذخیرہ دل ودماغ میں موجود ہے، جس میں سے کچھ نمونے ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

مشاجراتِ صحابہؓ کے متعلق حضرتِ استاذ احادیث کی دل ربا تشریح فرما کر عموماً فرماتے: اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کو اس سے بچایا ہے، اللہ ہماری زبانوں کو بھی اس سے بچائے۔ فرماتے: صحابہ کے متعلق ہمیشہ اچھا خیال وگمان رکھیں۔ حدیث واقعۂ افک میں مذکور حضرت علیؓ کی رائے ''**لم يضيق الله عليك والنساء سواها كثير**'' کی پُرحکمت توضیح کرنے کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت اسید بن حضیرؓ کے درمیان ہونے والی گفتگو جو بظاہر تلخ کلامی محسوس ہوتی ہے، کی تشریح ایسے عمدہ انداز میں پیش کرتے کہ ہر اشکال دم توڑ دیتا اور مثال میں یہ واقعہ پیش کرتے کہ مجھے ایک جگہ کسی خاندانی جھگڑے میں حکم بنایا گیا، ان میں ایک بڑے میاں تھے جو بے حد باوقار اور سنجیدہ انسان تھے، جس کا اندازہ ان کی گفتگو سے لگایا جا سکتا تھا، لیکن بات چیت کے دوران فریق مخالف میں سے ایک نوجوان اٹھا، جس نے قوم پرستی پر مبنی کوئی بات کہی، جس پر یہ بڑے میاں چراغ پا ہو گئے اور اسے برا بھلا کہا، مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر یہ پوری قوم کی نمائندگی

کرتے ہوئے جواب نہ دیتے تو فریقین کے دست وگریباں ہونے کا اندیشہ تھا۔صحیح بخاری میں حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جعرانہ سے عمرہ ادانہیں کیا، اگر ادا کیا ہوتا تو حضرت ابن عمرؓ پر مخفی نہ ہوتا۔ جبکہ دیگر صحیح روایتوں میں اس عمرہ کا ذکر ہے، جس سے استاذ محترمؒ بڑی عمدگی سے اس بات پر استدلال فرماتے کہ جس طرح عمرۂ جعرانہ، حضرت ابن عمرؓ پر مخفی رہا، تو اس میں کیا بعد ہے کہ رفع یدین کا نسخ بھی ان پر مخفی رہا ہو، جبکہ مسند حمیدی کے پرانے طبع میں (جوکہ جامعہ کے کتب خانہ میں موجود ہے) حضرت ابن عمرؓ کے عدم رفع یدین کا ذکر ہے اور حمیدی، امام بخاری کے استاد بھی ہیں۔

حدیث (لاعدوی ولاطیرۃ) کی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ایسی دلنشین تشریح فرماتے کہ دل باغ باغ ہو جاتا۔موجودہ زمانہ کے بعض وہ متجددین جوقربانی کرنے کو مال کا ضیاع گردانتے ہیں اور اس کے بدلے مالی صدقے کو مسلمانوں اور خلق خدا کی صلاح شمار کرتے ہیں، ان کے اعتراضات کو مدنظر رکھتے ہوئے قربانی کے معاشرتی، معاشی اور اقتصادی فوائد کو بیان کرتے کہ اس میں کن کن لوگوں کو روزگار کے مواقع میسر آتے ہیں اور اس کے گوشت سے غریبوں کی کن طریقوں سے مدد کی جاتی ہے۔

حدیث میں مذکور بیع قبل القبض کی نہی کی حکمت یہ بیان فرماتے کہ: اگر خریدنے والا، قبضہ اور وزن کرنے سے پہلے اسی جگہ پر بیچے گا تو درمیان میں زیادہ واسطے آتے اور اسی جگہ بکنے کی وجہ سے وہ چیز اپنی حقیقی قیمت سے کئی گنا مہنگی بکے گی، حتی کہ اصول فقہ کی بعض کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ غیر فقیہ صحابی کی روایت پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، اس کو بنیاد بنا کر بعض لوگ حضرت امام صاحبؒ پر بہت ربان طعن دراز کرتے ہیں، استاذ محترم بیان فرماتے کہ: یہ امام صاحبؒ کا قول نہیں، بلکہ عیسی بن ابان کی طرف منسوب ہے، جب کہ اس نسبت میں بھی کلام ہے۔اور یہ اصول اپنے لفظی اور تعبیری ضعف کی وجہ سے پیچیدگی کا شکار ہوا ہے۔ اس غلط بیانی اور غلط تشہیر کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی عقلیں فقہ واصول فقہ کی باریکیوں کے ادراک سے عاری و عاجز ہیں۔

استاذ محترمؒ کو ادب عربی وارد و سے گہرا لگاؤ تھا، جس کا ظہور درس کے دوران موقع بموقع ان اشعار سے ہوتا جنہیں حضرت استاذ استشہاد کے طور پر پڑھا کرتے تھے، وہ جدید لفظ کا مأ خذ اور پھر اس کی لفظی مناسبت بھی بتاتے، مثلاً: لفظ "**القافلة**" کے متعلق بتاتے کہ یہ "**القفول**" سے ہے، جس کے معنی واپس لوٹنے کے ہیں، قافلہ کو قافلہ تفاؤلاً کہا جاتا ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں بولے جانے والے الفاظ پر بھی حضرت الاستاذ کی گہری نظر ہوتی اور ان کی ایسی انوکھی مناسبت بیان فرماتے کہ

عقلیں دنگ رہ جاتیں، لفظ ''نائی'' کے متعلق ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ یہ میرے خیال سے ''الناعی'' سے ہے، نعیٰ ینعیٰ نعیاً کے معنی ہیں ''موت کی خبر دینا'' یہ لوگ چوں کہ عموماً گاؤں دیہات میں یہ فریضہ بھی انجام دیتے ہیں، لہذا انہیں ''ناعی'' کہا گیا۔ جس کی بگڑی ہوئی صورت لفظ ''نائی'' ہے۔ اردو ادب میں تذکیر و تانیث، تلفظ و لہجے کا خاص خیال رکھتے اور مزید توثیق کے لئے سر دست لغت دیکھتے، جس سے سامنے والا تحقیق کی عادت اپنانا سیکھتا۔ تقدم ذاتی اور تقدم زمانی میں فرق کو چابی اور ہاتھ کے گھمانے سے سمجھاتے کہ ذات کے اعتبار سے گھومنے میں مقدم ہاتھ ہے، چابی مؤخر، لیکن زمانہ دونوں کا ایک ہے۔ عرض کے عدم انتقال کو عطر اور اس کی خوشبو سے سمجھاتے کہ خوشبو بغیر جوہر (عطر) کے دوسری شیشی میں منتقل نہیں ہو سکتی۔

جام شہادت نوش فرمانے سے کچھ عرصے پہلے ہی مسلم شریف میں، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے موجود روایت **"اذنک علیّ ان ترفع الحجاب"** پر تحقیق فرمارہے تھے، عام شراح کے برعکس حضرت الاستاذ اس کا معنی یہ بیان فرماتے: **اذنی ایاک ان تجدالحجاب مرفوعاً(ای لاتحتاج الیٰ استئذان معتاد)بل یکفیک ان تری الحجاب مرفوعاً** یعنی جب پردہ اٹھا ہوا ہو تو آپ کے لئے میری طرف سے اندر آنے کی اجازت ہے، کسی اور طرح کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس صورت میں سوال یہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے تخصیص کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیتے کہ باقی حضرات صحابہ تو پردہ اٹھا ہوا دیکھ کر بھی اجازت طلب کرتے جبکہ حضرات ابن مسعودؓ کو اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس تقریر کے لئے درج ذیل دلائل پیش کرتے:

الف: مسلم شریف میں ایک نسخہ (یرفع) یاء کے ساتھ ہے جو اس تشریح کے لئے مؤید ہے۔

ب: علامہ نوویؒ نے اس پر عنوان قائم کیا ہے، **"باب جواز جعل الاذن رفع حجاب او غیرہ من العلامات"** بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے۔

ج: علامہ اُبی شارح مسلم کی شرح سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

بہرکیف حافظۂ خیال کی مدد سے یہ چند مثالیں بطور نمونہ عرض کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ بلا ناغہ قرآن وسنت کا بھرپور شغف کے ساتھ درس دینے والے استاذ محترمؒ کے ایسے کئی علمی، تحقیقی و تدقیقی نکات مرتب ہو سکتے ہیں، جن کے کے لئے شاید کئی دفاتر بھی کم ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے استاذ محترم کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کے سکھائے اور دکھائے ہوئے راستوں پر ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ شبانہ روز محنت سے آگے بڑھنے کی توفیق و ہمت مقدور فرمائے، آمین

قرآن پاک کے علاوہ دیگر آسمانی کتب یا ''گیتا'' کا مطالعہ!

مولوی محمد یوسف انور

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارہ میں کہ:

ا.....کوئی مسلمان قرآن مجید کے علاوہ دیگر تین آسمانی کتابیں ''زبور، توریت اور انجیل'' گھر میں مطالعہ کے لئے رکھ سکتا ہے؟

۲...... ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''گیتا'' گھر میں رکھ سکتا ہے یا مطالعہ کر سکتا ہے؟

۳.....کیا ''گیتا'' لکھنے والا (کرشن جی) پیغمبر ہے؟ اور کیا ''گیتا'' سچی کتاب ہے؟ اس آدمی (کرشن جی) کا ایمان کیسا ہے؟

مستفتی: اورنگزیب، صدر کراچی

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

ا.....توریت، زبور اور انجیل کا پڑھنا اور مطالعہ کے لئے گھر میں رکھنا مضبوط علم والے اور راسخ العقیدہ علماء کرام کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ موجودہ توریت، زبور اور انجیل تحریف شدہ ہیں، ان میں تحریف وتبدیلی کا وقوع قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس لئے ان کتب میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف بعض ایسے من گھڑت اور غلط قسم کے افعال واقوال کی نسبت کی گئی ہے، جن سے ان حضرات کی تقدیس مجروح ہوتی ہے، اور ان کتب کے پڑھنے سے عام آدمی وساوس میں مبتلا ہوگا، اپنے دین اور مذہب سے اعتماد اور اطمینان متأثر ہوسکتا ہے، نیز عقائد اور نظریات بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے۔

لہذا ان کتب کا گھر میں رکھنا اور مطالعہ کرنا عوام الناس کے لئے جائز نہیں ہے۔صرف ان مضبوط علم رکھنے والے اور راسخ العقیدہ علماء کرام کے لئے ان کتب کا ناقدانہ نظر سے مطالعہ کرنا جائز ہے، جو مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی خاطر ان کتب کا رد اور سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔حدیث شریف میں ہے:

''عن جابرؓ عن النبی ﷺ حین أتاہ عمرؓ، فقال: إنا نسمع أحادیث من یهود تعجبنا أفتریٰ أن نکتب بعضها؟ فقال: أمُتَهَوِّکُونَ أنتم کما تَهَوَّکَتِ الیهودُ

والنصاریٰ؟ لقد جئتکم بها بیضاء نقیة ولو کان موسیٰ حیاً ما وسعه إلا اتباعی".

(رواه أحمد والبیهقی فی شعب الإیمان". (مشکوة، ص:۳۰/قدیمی)

وفی روایة:"عن جابرؓ أن عمر بن الخطابؓ أتی رسول الله ﷺ بنسخة من التوراة فقال: یا رسول الله! هٰذه نسخة من التوراة، فسکت، فجعل یقرأ، ووجه رسول الله ﷺ یتغیر، فقال أبوبکرؓ: ثکلتک الثواکل ما تری ما بوجه رسول الله ﷺ؟ فقال: أعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله، رضینا بالله ربًّا وبالإسلام دیناً، وبمحمد نبیاً. فقال رسول الله ﷺ: والذی نفس محمد بیده لو بدالکم موسیٰ فاتبعتموه وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل، ولو کان حیا وأدرک نبوتی لاتبعنی. رواه الدارمی". (مشکوة، ص: ۳۲/قدیمی)

''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:''ومن العلوم المذمومة علوم الفلاسفة، فإنه لایجوز قراء تها لمن لم یکن متبحراً فی العلم وسائر الحجج علیهم وحل شبهاتهم والخروج عن إشکالاتهم". (کتاب الکراهیة ۵/۳۷۸، رشیدیة)

۲...... ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''گیتا'' کو گھر میں رکھنا اور مطالعہ کرنا عوام الناس کے لئے جائز نہیں، اس سے اجتناب لازم ہے۔

''قال الشیخ الإمام صدر الإسلام أبو الیسر: نظرت فی الکتب التی صنفها المتقدمون فی علم التوحید، فوجدت بعضها للفلاسفة مثل اسحاق الکندی والاستقراری وأمثالهما وذلک کله خارج عن الدین المستقیم زائغ عن الطریق القویم فلایجوز النظر فی تلک الکتب ولایجوز إمساکها، فإنها مشحونة من الشرک والضلال...... کیلا تحدث الشکوک ولایتمکن الوهن فی العقائد". (کتاب الکراهیة، ۵/۳۷۷، رشیدیة)

۳...... ''گیتا'' نامی کتاب ہندوؤں کے مذہبی پیشوا ''کرشن جی'' کے ایک وعظ پر مشتمل ہے۔ اور ''کرشن جی'' کا نبی ہونا ثابت نہیں ہے اور نہ ''گیتا'' نامی کتاب کا سچی کتاب ہونا ثابت ہے اور نہ ہی کسی معتبر ذریعہ سے ''کرشن جی'' کا مومن (صاحب ایمان) ہونا ثابت ہے۔

لہذا جولوگ ''کرشن جی'' کو نبی اور پیغمبر یا ''گیتا'' نامی کتاب کو سچی کتاب کہتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ (بحوالہ: کفایت المفتی، ۱/۸۹، ۹۰، ۱۰۸/دارالاشاعت کراچی)۔ فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد عبدالمجید دین پوری	محمد شفیق عارف	محمد یوسف انور
		تخصصِ فقہِ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نقد ونظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

ادارہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی اخلاق

مولانا محمد ہارون معاویہ، صفحات: ۴۸۰، عام قیمت: ۴۰۰ روپے، رعائتی قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: قدیمی کتب خانہ، مقابل آرام باغ، کراچی، فون: ۰۲۱-۳۲۶۲۷۶۰۸، ۰۲۱-۳۲۶۲۳۷۸۲

خوش قسمت ہے امت مسلمہ کہ ان کے نبی ﷺ کی ہر اداء محفوظ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا، پینا، چال، ڈھال، وضع قطع، سیرت وصورت سے لے کر عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق تک سب محفوظ ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ”**إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق**“۔ یعنی ”مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا، تاکہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں“۔

آج مسلمان غیر مسلموں کی جھوٹی اداؤں اور مصنوعی طرز زندگی کو اپنانے میں فخر محسوس کر رہا ہے، حالانکہ نہ انہیں قلبی سکون میسر ہے اور نہ ہی اس سے معاشرہ میں کوئی بہتری کے آثار نظر آتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو پڑھ کر ان کو خود بھی اپنائے اور اپنی نئی نسل کو بھی اس پر پروان چڑھائے، اس غرض سے مؤلف موصوف نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے یہ اہم کوشش فرمائی ہے۔

تحفة المنعم اردو شرح صحیح مسلم (جلد اول)

حضرت مولانا فضل محمد صاحب یوسف زئی دامت برکاتہم، صفحات: ۷۲۰، قیمت: درج نہیں، ناشر: مکتبہ اویس القرنی، کراچی۔ رابطہ کے لئے: مکتبہ امام محمدؒ، سلام کتب مارکیٹ، علامہ محمد

یوسف بنوری ٹاؤن، کراچی۔

مؤلف موصوف ماشاء اللہ طویل عرصہ سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں درسِ حدیث دے رہے ہیں، آپ نے کئی سال تک مشکوٰۃ کا درس دیا اور دورانِ درس علمی افادات کو یکجا کر کے توضیحات شرح مشکوٰۃ کے نام سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب مدوّن فرمائی۔ اب عرصہ چھ سال سے آپ صحیح مسلم کا درس دے رہے ہیں، صحیح مسلم کی احادیث کی تشریح وتبیین پر مشتمل تحفة المنعم کے نام سے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، مؤلف نے اس شرح سے متعلق ''چند باتیں'' کا عنوان قائم کر کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے کہ:

''میں نے اس شرح میں ایک خالص مدرس کے لئے وہ مواد اکٹھا کیا ہے کہ وہ تدریس سے متعلقہ تمام عمومی امور کو ایک جگہ موجود پائے گا، خصوصاً کتاب کو شروع کرتے وقت کوئی بھی مدرس ہو، وہ اس شرح کے ابتدائی مباحث میں وہ سب کچھ پائے گا جس کی اس کو ضرورت ہوگی۔ میں اس شرح میں اس بات کا پورا خیال رکھوں گا کہ یہ نہ اتنا طویل ہو کہ طلبہ اکتا جائیں اور نہ اتنا مختصر ہو کہ طلبہ تشنہ لب رہ جائیں، بلکہ معتدل اور متوسط ہو۔ میں نے اس شرح میں انداز بیان اس طرح رکھا ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ میں نے اس شرح میں جمہور امت کا مسلک اختیار کیا ہے، کسی شاذ قول یا کسی کے تفرد پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ میں نے مسلم شریف کی اس شرح میں ہر باب اور ہر کتاب کی ابتداء میں پورے باب اور پوری کتاب سے متعلق اس طرح کلام کیا ہے جو پورے باب اور کتاب کے لئے کافی شافی ہوجائے گا۔ میں نے اس شرح میں جس طرح مسلم جلد اول میں تحقیق وتشریح کی ہے، اسی طرح مسلم جلد ثانی میں بھی تحقیق وتشریح کروں گا، ایسا نہیں کیا کہ جلد اول اور ابتداء میں خوب تفصیل ہو اور جلد ثانی میں تعطیل ہو، بلکہ جلد ثانی میں تفصیل ان شاء اللہ جلد اول سے کم نہیں ہوگی۔ میں نے اس شرح میں اس کا زیادہ خیال رکھا ہے کہ مشکل لغات کے معانی کی وضاحت ہوجائے اور مجمل عبارت کی تفصیل اور مطلب بیان ہوجائے۔ بہرحال میں نے ایک مدرس کی حیثیت سے اس شرح کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ ان شاء اللہ ایک مدرس، بلکہ ایک طالب علم صحیح مسلم کے کسی مقام میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہوگا، بلکہ ہر مقام کو سمجھنے کے حوالے سے اس کو آسان سے آسان تر پائے گا، باقی تمام علوم کا احاطہ کوئی انسان نہیں کرسکتا ہے،'' **وفوق کل ذی علم علیم، واللہ یعلم وأنتم لاتعلمون**''۔

تحفة القاری بحل مافی صحیح البخاری (جلد سوم)

محمد یوسف مدنی مدظلہ، صفحات: ۵۴۲، قیمت: درج نہیں، ناشر: مکتبۃ الشیخ، ۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی نمبر: ۵

زیرِتبصرہ کتاب تحفۃ القاری بحل مافی صحیح البخاری جلد سوم طالبات صحیح بخاری کے نصاب میں شامل کتاب المناقب، فضائل الصحابہؓ تا بنیان الکعبۃ کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے، اس کی پہلی دو جلدوں پر بینات میں تبصرہ ہو چکا ہے، کتاب کی ابتداء میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم کی آراء گرامی کتاب کی ثقاہت کے لئے کافی دلیل ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کتاب کو مؤلف، ناشر اور قارئین کے لئے نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنائے، آمین۔

اسلامی عقائد

ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب، صفحات: ۲۴۶، قیمت: درج نہیں، ناشر: فضل ربی ندوی، مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر: ا کراچی، فون: ۳۶۶۰۰۸۹۶-۰۲۱

حضرت مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب ماشاء اللہ دینی ودنیوی دونوں تعلیموں سے آراستہ ہیں، آپ نے مسلمان نوجوانوں کا وہ طبقہ جو دینی اداروں سے دور اور عصری تعلیم گاہوں میں مصروف ہے، ان کے لئے ایک مختصر فہم دین کورس مرتب کیا، جو تین کتابوں پر مشتمل ہے: ا......اسلامی عقائد، ۲...... اصولِ دین، ۳:...... مسائل بہشتی زیور (۲ حصے) یہ تینوں کتابیں پڑھنے والوں کے لئے ان کی دینی ضروریات کا ایک حدتک پورا کرتی ہیں اور بہت سے ذہنی خلجان کو رفع کرنے کا مؤثر ذریعہ اور بہت سی گمراہیوں سے بچاؤ کا بہترین ہتھیار ہیں۔ زیرِتبصرہ کتاب ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

باب: ا...... اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان۔ باب: ۲...... انبیاء ورسل سے متعلق عقائد۔ باب: ۳...... معجزات یا دلائل نبوت۔ باب: ۴...... انبیاء علیہم السلام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازات۔ باب: ۵...... عقیدہ حیات النبی۔ باب: ۶...... مبتدعین کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں غلو اور اس کا جواب۔ باب: ۷...... فرشتوں کا بیان۔ باب: ۸...... کتب الٰہیہ کا بیان۔ باب: ۹...... جنات کا بیان۔ باب: ۱۰...... علاماتِ قیامت۔ باب: ۱۱...... قبر میں عذاب وراحت اور فرشتوں کا سوال ثابت ہے۔ باب: ۱۲...... عقائد متعلقہ عالم آخرت۔ باب: ۱۳...... عقیدۂ شفاعت۔ باب: ۱۴...... جنت ودوزخ۔ باب: ۱۵...... عقائد متعلقہ صحابہ کرامؓ۔ باب: ۱۶...... تقدیر کا بیان۔ باب: ۱۷...... امامت وخلافت۔ باب: ۱۸...... ایمان کا بیان۔ باب: ۱۹...... شرک کا بیان۔

یہ کتاب تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مرد وخواتین کے لئے بہت ہی مفید نصاب ہے، امید ہے دینی فکر رکھنے والے حضرات اس کی خوب قدر افزائی کریں گے۔